خیمے سے دُور

انتظار حسین

"http://Pakfunplace.com"
Online Free Urdu/English Novels one provides to USERS Urdu and English books/Novels/Digests Free Online download. A place for Urdu and English books/Novels/Digests Lover where They can find all types of books/Novels/Digests. Get all the Free Downloads of Urdu Novels, English Novels, Islamic History Books, Monthly Digests, Animes, t.v Series Online in fastest "Resumable Mediafire Links"...

PakFunPlace.Com

http://www.pakfunplace.com

ترتیب

خیمے سے دُور	۷
سفرِ منزل شب	۱۸
حصار	۳۱
نزاری	۴۸
پُراگیان	۵۸
دُھوپ	۷۰
برہہ کی کہانی	۷۵
اجنبی پرندے	۸۹
برہمن بکرا	۹۸
وقت	۱۰۵
اِنتظار	۱۱۴
پلیٹ فارم	۱۳۱
چیلیں	۱۳۹
پرانی کہانی	۱۵۹

http://www.pakfunplace.com

دسواں قدم ۱۶۸

خالی گھر ۱۹۱

خواب میں دھوپ ۲۰۷

خیمے سے دُور

"یہاں کب تک بند بیٹھے رہیں۔ اب نکلنا چاہیئے۔" اکتا کر پہلے نے کہا۔

"نکل کر کہاں جائیں"، دوسرے نے تھوڑا چڑ کر کہا۔ اصل میں پہلے نے اتنی بار نکل چلنے کا سوال اٹھایا تھا کہ دوسرے نے سوچا کہ کسی طور اس کا منہ بند کرنا چاہیئے اور واقعی تھوڑی دیر کے لئے تو اس کا منہ بند ہو ہی گیا وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو ابھی تک اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں سے نکل کر جائیں گے کہاں۔ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ جب بہت اُلجھ گیا تو بولا "نکل کر کہیں بھی جائیں باہر تو نکلیں۔"

"مگر باہر کے متعلق کچھ پتا تو چلے۔ یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونا عاقبت اندیشی تو نہیں ہے" اس نے سمجھانے کے لہجہ میں کہا۔ وہ جو تھوڑا چڑچڑا پن اس میں پیدا ہو گیا تھا اس پر اب اس نے قابو پا لیا تھا۔ اس کا تحمل اور تامل واپس آ گیا تھا۔

"باہر کے متعلق ہمیں پتہ کیسے چلے گا۔ اندر اسی طرح بند بیٹھے رہے تو بے شک دنیا بدل جائے ہمیں کیا خبر ہو گی۔"

دوسرے نے پھر اسی تحمل کے ساتھ جواب دیا جیسے اسے سمجھا پھلا رہا ہو جو گئے ہیں واپس آ جائیں ان سے کچھ پتہ چلے گا۔ پھر نکلنے کے متعلق سوچیں گے۔"

پہلا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ بولا "کب کے گئے ہیں۔ پلٹے ہی نہیں، آخر کب تک ان کا انتظار کیا جائے" رکا۔ پھر بولا "اگر وہ نہ آئے تو؟"

اس اچانک سوال پر دوسرا تھوڑا بوکھلا گیا۔ اگر وہ نہ آئے تو؟ .... اگر وہ نہ آئے تو؟ .... کتنی دیر تک یہ سوال اس کے اندر گونجتا رہا۔ اس امکان پر تو اس نے غور ہی نہیں

http://www.pakfunplace.com

کیا تھا۔ ایک تشویش کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ اسے خیال آیا کہ واقعی اب تک تو انہیں آجانا چاہیئے تھا۔ پھر کیوں نہیں آئے۔ کوئی ایک تو آجاتا۔ کیوں؟ اور پھر وہی تشویش کہ اگر وہ نہ آئے تو۔ مگر اس نے اپنی اس تشویش کو بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بظاہر اعتماد کے لہجہ میں بولا "نہیں، وہ آئیں گے۔"

"ہاں انہیں آنا تو چاہیئے لیکن اگر نہ آئے تو؟" پھر وہی سوال۔ پھر وہ اکھڑنے لگا تھا۔ مگر پھر اس نے اپنے آپ کو تھاما "نہیں وہ آئیں گے۔" اور پھر قطعی لہجہ میں کہا "ہمیں ان کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"مگر کب تک؟"

اس سوال نے اسے پھر پریشان کر دیا۔ انتظار کی مدت کا متعین کرنا اسے کتنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ کیا خبر ہے کب آئیں اور کیا خبر ہے کہ نہ آئیں؟ پھر وسوسے کی لہر اٹھنے لگی تھی۔ مگر اس نے فوراً ہی اسے رفع دفع کر دیا۔ "بہر حال ہمیں ان کا انتظار کرنا ہے۔"

اس قطعی جواب کے بعد کوئی کیا کہتا۔ پہلا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔ دوسرے نے پہلے کو دیکھا کہ وہ چپ تو ہو گیا ہے مگر کتنا بے اطمینان ہے۔ سمجھانے کے لہجہ میں بولا "میرے یار! تجھے باہر کے حالات کا اندازہ نہیں مجھے ہے۔ میں یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

پہلا بولا "میرے دوست، تجھے باہر کے حالات کا تو اندازہ ہے، اندر کے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ اب تو مجھے دو ٹانگوں پہ کھڑا ہونا دوبھر لگتا ہے۔ چلنے کی خواہش ہی ختم ہو گئی۔ تھوڑے دن اور یہاں بند رہے تو ٹانگوں پہ چلنا بھول ہی جائیں گے، رینگنا شروع کر دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ پچھلی رات جب اسے اس بند جگہ سے بہت خفقان ہوا تھا تو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ سمٹ جائے اتنا کہ کنواڑ اور چوکھٹ کے بیچ جو دراڑ ہے اس میں سے رینگ کر نکل جائے۔

تیسرے نے جو کتنی دیر سے آنکھیں موندے ہوئے منہ ان دونوں سے بے تعلق بے سُدھ پڑا تھا جیسے وہ ان کے بیچ ہے ہی نہیں، آنکھیں کھول کر غور سے پہلے کو دیکھا۔ عجیب نظروں سے کہ پہلا پسینہ پسینہ ہو گیا۔ مگر اس نے دم بھر دیکھ کر پھر آنکھیں موند لیں۔ اس کے آنکھیں موند لینے کے بعد پہلے نے اسے غور سے دیکھا پھر جیسے کسی شک میں پڑ گیا ہو۔ دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر دوسرا اسے کچھ کہتے کہتے اچانک دم بخود ہو گیا جیسے اسے کچھ سنائی دیا ہے۔ پہلا چونکا اور وہ بھی دم بخود ہو گیا۔ تیسرے نے آنکھیں کھولیں اور خلا میں تکنے لگا تو واقعی کچھ آہٹ ہوئی تھی۔ کان اس آہٹ پہ لگے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ وہ تینوں چوکنے، سہمے، خوفزدہ ہو گئے تھے۔

"کوئی ہے،" پہلے نے کسی قدر شک کے ساتھ کہا۔

"لگتا یہی ہے۔ کوئی ہے۔"

"پتہ نہیں کون ہے،" پہلے نے وسوسے کے ساتھ کہا۔

وسوسہ دوسرے کو بھی تھا۔ مگر اس نے وسوسہ پر قابو پاتے ہوئے متانت کے ساتھ کہا "وہی ہوں گے۔"

"ہاں ہونا تو انہیں ہی چاہیئے۔ لیکن اگر وہ نہ ہوئے تو پھر کون ہو سکتا ہے۔"

پھر کون ہو سکتا ہے، یہ کہتے ہوئے وہ خود بھی خوفزدہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی خوفزدہ کر دیا۔ دل کس بری طرح دھڑکنے لگے اور دھیان کس کس طرف گیا۔

دروازے پر بہت ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ دم بخود رہے۔ پھر دستک ہوئی، اتنی ہی ہلکی۔ آخر دوسرے نے ہمت کی۔ آہستہ سے اٹھا۔ دبے پاؤں دروازے تک گیا۔ دراڑ میں سے جھانکا۔ کسی نے سرگوشی میں کہا "کھولو۔" دوسرے نے شاید آواز پہچان لی تھی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ جو داخل ہوا وہ ان کا چوتھا تھا۔ اسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

"تم اکیلے ؟" دوسرے نے تعجب سے کہا،

"اچھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے" چوتھے نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

"نہیں ابھی تک تو آیا نہیں ہے"

"پھر آتا ہوگا" چوتھے نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔

"باہر کیا حال ہے"

"بہت، ہجوم تھا مشکل سے نکل کر آیا ہوں"

"ہجوم ـــ ؟" پہلے اور دوسرے نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"ہاں بہت ہجوم تھا۔ لوگ ہی لوگ۔"

"عجب بات ہے" پہلا بولا "اس وقت تو کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ نہ کوئی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ جیسے یہاں لوگ ہیں ہی نہیں"

"مگر اس وقت بہت لوگ ہیں اور بہت شور ہے"

"کہاں سے آگئے اتنے لوگ ؟" پہلا بدستور حیران تھا۔

"میں خود حیران تھا کہ یا اللہ یہ لوگ پہلے کہاں تھے اور اب کیسے اور کہاں سے نکل آئے۔ پتہ نہیں کن کن کونوں۔ کھدڑوں سے نکل آئے ہیں۔ بہت لوگ ہیں اور چوک میں تو سروں کا سیلاب امڈا ہوا ہے"

"پھر ہمیں بھی نکلنا چاہیئے۔ ہم یہاں کیوں بند بیٹھے ہیں" پہلے نے بیکل ہو کر کہا۔

اس پر چوتھا چپ ہو گیا۔ تامل کے بعد بولا "ہاں نکلنا تو چاہیئے۔ سوچ لیں"

"سوچنے کی اس میں کیا بات ہے۔ میرے خیال میں اب یہاں سے نکلنا ہی چاہیئے۔ بند بیٹھے بیٹھے مجھے تو پھپھوندی لگ گئی۔ کتنے دن سے آسمان نہیں دیکھا۔ بس اب نکلنا چاہیئے"

"چوتھا چپ رہا" پھر بولا "پہچانے نہ جائیں"

"اتنے، ہجوم میں کون کس کو پہچانتا ہے"

"یہ بھی ٹھیک ہے" چوتھے نے جواب دیا "ہجوم تو بہت ہے مگر پہچاننے والے سب جگہ ہوتے ہیں"

"ٹھیک کہتے ہو" دوسرے نے چوتھے کی تائید کی "ہجوم تو بہت ہے لوگوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی نے پہچان لیا تو ؟"

"اس کا بہت خطرہ ہے" چوتھا اب زیادہ اعتماد سے بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسی طرح بند بیٹھے رہیں، لوگ باہر نکلے ہوتے ہیں، ہم اندر گھٹے بیٹھے رہیں" پہلے نے غصے سے کہا۔

"نہیں، اب زیادہ دیر تو اندر بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے" دوسرے نے تحمل سے جواب دیا۔ مگر عجلت نہیں برتنی چاہیئے۔ ذرا سی عجلت ہمیں کسی بڑی مشکل میں پھنسا سکتی ہے۔ تو بہتر یہ ہے کہ تھوڑا انتظار کر لیں اور جو قدم اٹھائیں احتیاط سے اٹھائیں"

"انتظار، احتیاط" دوسرا ہونٹ چباتے ہوئے بڑبڑایا۔

تیسرے نے آنکھیں کھولیں "چوتھے کو گھور کر دیکھا" تجھے کسی نے پہچانا ؟"

چوتھے نے اب تک اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ اب جو اس نے گھور کر دیکھا اور سیدھا سوال کیا تو اس نے اسے دیکھا۔ اس کے لئے وہ اجنبی تھا۔ مگر اس کے پاس یہ سوچنے کی کہ یہ کون ہے زیادہ مہلت نہیں تھی۔ ایک سیدھے سوال نے اسے پکڑ لیا تھا اور اب اسے خیال آیا اور کسی قدر تعجب کے ساتھ کہ وہ اتنے بڑے ہجوم سے گزر کر آرہا ہے۔ جہاں ہر قسم کے آدمی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی اور کسی نے اسے نہ پہچانا "مجھے ـــ ہاں مجھے تو کسی نے نہیں پہچانا۔ بس نظروں میں نہیں آیا۔ بچ ہی گیا۔ اتفاق کی بات ہے حالانکہ سگریٹ کے لئے بیچ چوک میں رکنا پڑا۔ البرٹ سینما کے سامنے پان سگریٹ کی جو دکان ہے وہاں کتنے اپنے جاننے والے کھڑے رہتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت کوئی ایسا تھا ہی نہیں جو مجھے پہچانتا"

http://www.pakfunplace.com

"میرے ساتھ دمشق میں یہی ہوا تھا۔" تیسرا بولا۔

"دمشق میں؟" تینوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ دمشق میں جانا اس روز کتنے سجائے گئے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ جلوس کا انتظار تھا۔"

"تو دمشق کب گیا تھا؟" پہلے نے طنز بھرے لہجہ میں پوچھا۔

"بس اُسی روز پہنچا تھا جس روز سَر اس شہر میں پہنچے ہیں۔"

"سَر؟ کیسے سَر؟"

"نیزوں پہ بلند باوقار سر۔" یہ کہتے کہتے تیسرا کسی تصور میں کھو گیا جیسے ان کے بیچ سے نکل کر کہیں دور چلا گیا ہو پھر بڑبڑایا۔ "اونچے نیزے پہ بلند باوقار معنبر سر، منور چہرہ، گرد میں اٹا ہوا، لب ہلتے ہوئے، قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے۔"

چوتھے نے غور سے کسی قدر شک سے اسے دیکھا، سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے پہلے اور دوسرے کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔

دوسرا کچھ کہنے لگا تھا کہ اچانک دم بخود ہو گیا۔ پھر سرگوشی میں پہلے اور چوتھے سے مخاطب ہوا،

"تم نے سنا؟"

"کیا۔۔؟"

"قدموں کی آہٹ۔"

"اچھا۔۔؟"

"ہاں۔" کہتے کہتے چپ ہوا اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ "سنو۔"

"ہاں، کوئی ہے۔" پہلے نے اس کے شک کی توثیق کی۔

"اسے آنا تھا۔ وہی ہوگا۔" چوتھا بولا۔

"ہاں ہونا تو اسے ہی چاہیئے۔" پہلا بولا۔ "مگر کیا خبر ہے" دوسرا چوتھے سے مخاطب ہوا۔

"تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟"

"نہیں اصل میں مجھے کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ دیکھتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔"

"پھر تو اسے ہی ہونا چاہیئے۔" دوسرے نے کسی قدر بے یقینی کے ساتھ کہا۔ تامل کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دبے پاؤں چل کر دروازے تک گیا۔ کنواڑ کی دراڑ میں سے جھانکا۔ پھر دستک ہوئی اور دبی سی آواز "کھولو۔" اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا وہ اندر آ گیا۔ وہ وہی تھا ان میں کا پانچواں "یار تم نے آنے میں بہت دیر لگائی۔ مجھے تو فکر ہو گئی تھی" چوتھے نے کہا۔

پانچواں ابھی اپنے حواس درست کر رہا تھا۔ اس نے اس سوال کا فوراً جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ دوسرا بیچ میں بول پڑا "اتنے بڑے ہجوم کے بیچ سے نکل کر آنے میں بھی تو وقت لگتا ہے دیر تو ہونی ہی تھی۔"

"ہجوم؟" پانچویں نے تعجب سے دوسرے کو دیکھا "کیسا ہجوم؟ شہر شہر خموشاں بنا ہوا ہے۔ تم ہجوم کی بات کر رہے ہو۔"

"کیا؟" اب دوسرے نے پانچویں کو تعجب سے دیکھا اور پھر فوراً چوتھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"یار کیا بات کر رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں آیا ہوں۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ شہر خلقت سے اُبلا پڑ رہا تھا۔" چوتھا بولا۔

پانچویں نے حیرت سے یہ بات سنی۔ پھر بولا "یار، تم نے خواب تو نہیں دیکھا تھا۔"

"میں واقعہ بیان کر رہا ہوں۔"

"اچھا۔" رکا پھر بولا "میں نے تو ہو کا عالم دیکھا۔ عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں تھا اور میرے قدموں کی آواز۔ باقی سب سنسان۔"

http://www.pakfunplace.com

چوتھا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "تم چوک کی طرف گئے تھے"

"ادھر ہی سے ہوتا ہوا آیا ہوں۔ چوک میں اُلو بول رہا ہے اور البرٹ سینما جہاں اتنی چہل پہل رہتی تھی بند پڑا ہے"

"البرٹ سینما بند پڑا ہے؟" چوتھا اب بالکل چکرا گیا تھا "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہاں ٹکٹوں کے لیے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہاں تو سناٹا ہے۔"

"دم کے دم میں سناٹا،" چوتھا بڑبڑایا "کہاں گئے لوگ"

"یہی میں سوچ رہا تھا کہ لوگ کہاں گئے"

"پہلا ہنسا اور بولا "اس شہر کے لوگ تو جن بھوت ہو گئے۔ دم میں حاضر دم میں غائب"

پھر ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

"شاید ہم لوگ بھی۔۔۔ کم از کم میں سایا بن چکا ہوں"

"بنے تو نہیں ہیں" دوسرا بولا "بن جائیں گے۔"

"تیسرے نے اسی طرح اوندھے پڑے پڑے آنکھیں کھولیں، ایک ایک کو گھور کر دیکھا"

"اچھا تم لوگ بھی"

چوتھے کو ایک دم سے پھر خیال آیا کہ یہ کون شخص ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے دوسرے کو دیکھنے لگا تھا جیسے کچھ پوچھنے والا ہو۔ اتنے میں پہلا بول پڑا "ویسے اچھا ہی ہے۔"

"کیا اچھا ہے؟"

"یہی کہ اس وقت کوئی نہیں ہے۔ نکل چلیں، موقع اچھا ہے"

دوسرے پس و پیش میں پڑ گئے۔ مگر پانچویں نے اس کی بات کاٹ دی "کیا باتیں کرتے ہو۔ اس وقت نکلو گے۔"

اس سے بہتر وقت اور کون سا آئے گا۔ کوئی دیکھنے والا ہے ہی نہیں "پہلے نے اپنے

موقف کے حق میں دلیل پیش کی۔

"بات یہ ہے" پانچواں بولا "لوگ چل پھر رہے ہوں تو نکلنے میں آسانی رہتی ہے۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا کہ کون جا رہا ہے لیکن سڑکیں خالی ہوں اور شہر میں سناٹا ہو اور پھر کوئی گزرتا نظر آئے تو خواہ مخواہ شک ہوتا ہے۔"

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا "ٹھیک کہتے ہو"

پہلا بولا "جب کوئی ہے ہی نہیں تو کون دیکھے گا اور کون شک کرے گا"

پانچواں طنزیہ ہنسی ہنسا "تم بہت سادے ہو۔ ایسے ہی وقت میں جب کوئی نظر نہیں آتا۔ آدمی کو زیادہ دیکھا جاتا ہے اور زیادہ شک کیا جاتا ہے"

تیسرے نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھولیں۔ پانچویں کو گھور کر دیکھا "تجھ پر کسی کو شک ہوا؟"

اس آن پانچویں کو خیال آیا اور اس خیال پر وہ ششدر رہ گیا کہ وہ سائیں سائیں کرتے رستوں سے گزر کر آیا ہے۔ مگر کسی کو اس پر شک نہیں ہوا۔ بولا "میرے ساتھ تو کمال ہوا۔ سڑکیں خالی۔ بس میں اکیلا چل رہا تھا اوپر کا دم اوپر نیچے کا دم نیچے کہ کسی نے تاڑ لیا تو۔ مگر بچ گیا۔"

"میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔" تیسرا سوچتے ہوئے بولا۔ جیسے کچھ یاد آ گیا ہو "وہ رات بہت ویران تھی چاروں طرف سناٹا۔ بس صحرا کے سانس کی آواز تھی۔ مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ قریب ہی فرات پر لشکر پڑا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟۔۔۔ مگر بچ گیا"

"فرات؟"

"ہاں فرات" رکا، پھر سوچتے ہوئے بولا "میں سمجھا کہ کوئی مجھے نکلتے ہوئے نہیں دیکھے گا کہ چراغ تو اس جناب نے گل کر دیا تھا۔ مگر جب میں نکلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ خیمہ تو منور ہے اور سب نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ بس جیسے میں سب کے سامنے برہنہ ہو گیا ہوں۔ منہ چھپا کر تیزی سے نکل آیا۔"

http://www.pakfunplace.com

رُکا، خیالوں میں کھو گیا۔ پھر بڑبڑایا "فرات کے کنارے ٹھوکر پڑا تھا۔ قدم قدم پہ پہرہ۔ دھڑکا کہ اب پکڑا گیا۔ مگر کسی نے دیکھا ہی نہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور چاروں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر جیسے سب کچھ سمجھ میں آگیا ہو، "اچھا تو تھا وہ آدمی۔"

"ہاں" اس نے بمشکل کہا اور اس کا سر جھک گیا۔ دوسرے نے تامل کیا پھر کہا "اگر تو وہی ہے۔۔۔۔۔؟" اس نے فوراً بات کاٹی "نہیں، میں وہی نہیں ہوں"

"تو وہی نہیں ہے؟" دوسرا چکرایا "مگر ابھی جو تو نے بیان کیا اور اقرار کیا"

"عزیزو۔ میں نے صحیح بیان کیا اور صحیح اقرار کیا۔ ہوا یوں کہ جب میں دمشق پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اہلِ تقویٰ اشکل میں ہیں ان پر شک کیا جا رہا ہے۔ انہیں پکڑا جا رہا ہے۔ میں ڈرا کہ کہیں میں پہچانا نہ جاؤں۔ مگر عجیب ہوا کہ کسی نے مجھے نہ پہچانا، کسی کو مجھ پر شک نہیں گزرا۔ تب مجھے دھیان آیا کہ جب میں خیمے سے نکلا تھا تو نکلتے نکلتے جیسے کہیں میں اپنے بیچ سے نکل گیا۔ تو جب میں خیمے سے باہر آیا تو میں وہ نہیں تھا، کوئی اور تھا۔۔۔۔۔۔ ہاں بالکل۔ پھر میں کوئی اور تھا۔"

وہ چاروں اسے تکنے لگے۔ پریشان کہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر وہ انہیں تکنے لگا۔ ایک ایک کی صورت کو غور سے دیکھا۔ حیران ہوا "تم وہی ہو۔"

"ہم؟" وہ ایسے چونکے جیسے ان پر اچانک حملہ ہو گیا ہو۔ سٹپٹا کے ایک دوسرے کو دیکھا، جلدی سے دفاعی انداز میں بولے "ہم وہی ہیں۔۔۔ ہوتے"

"اچھا؟" وہ اور حیران ہوا۔ ایک دفعہ پھر باری باری چاروں صورتوں کو غور سے دیکھا۔ "تو گویا جب تم خیمے سے نکلے تھے تو تم۔۔۔۔"

"خیمے سے؟ کس خیمے سے؟" انہوں نے بیک زبان عجلت سے اس کی بات کاٹی۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ حیران انہیں تکتا رہا۔ وہ خود ہی چکر میں پڑ گئے۔ آپس میں ایک دوسرے

کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سرگوشی میں ایک دوسرے سے پوچھا "یار، ہم کس خیمے سے نکلے تھے؟"

اس یا ہمی سوال نے انہیں مزید چکرا دیا۔ کچھ حیران کچھ پریشان ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس عالم میں دوسرے نے خود اعتمادی دکھائی۔ بڑے یقین سے کہا "عزیزو، ہم کسی خیمے سے نہیں نکلے"

دوسرے نے فوراً تائید میں سر ہلایا "ٹھیک بات ہے ہم کسی خیمے سے نہیں نکلے ہیں"

پھر وہ چپ ہو گئے۔ آگے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہا جائے۔ یہ بھی چپ رہا بس انہیں تکتا رہا۔ بڑبڑایا "عجیب بات ہے" چپ ہو گیا۔ پھر بڑبڑایا "مجھے کم از کم یاد تو ہے۔"

---

http://www.pakfunplace.com

سفرِ منزلِ شب

"اچھا؟...... تو؟...... تو وہ تو تھا؟"

ہاشم، حیدر، جنید، حمید، چاروں کی نظریں حبیب پر جم گئیں۔ ان پر یہ انکشاف بجلی بن کر گرا تھا۔ وہ تو سکتے میں آ گئے۔ کتنی دیر تک پتھر بنے بیٹھے رہے۔

"مگر......" حیدر نے زبان کھولی۔ کچھ کہنے لگا تھا۔ کیا کہنے لگا تھا۔ کہتے کہتے جیسے الجھ گیا ہو۔ چپ ہو گیا۔

پھر حمید نے جھرجھری لی "مجھے یقین نہیں آ رہا" اور اس نے حبیب کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولے۔ شاید یہ کہے کہ وہ کوئی اور تھا، وہ نہیں تھا۔ مگر حبیب نے تو جیسے ہونٹ سی لیے تھے۔

حمید نے پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ لہجہ میں تھوڑا تحمل پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "تو اس سے انکار نہیں کرے گا؟"

پھر سب کی متجسس نظریں اس پہ جم گئیں۔ شاید اب وہ کچھ بولے گا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہے گا۔ مگر ہونٹ سل گئے تھے، سلے رہے۔

"تو ہم یہ سمجھیں کہ" آخر جنید نے قطعی لہجہ میں زبان کھولی "وہ تو ہی تھا"

ذرا جو اس نے جنبش کی ہو۔

رفتہ رفتہ حیرت اور بے یقینی کے لمحے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ انہیں یقین آ گیا کہ وہ شخص وہی ہے اور ان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

چاروں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ وہ جو انہیں

میں سے تھا اچانک ان میں سے نہیں رہا تھا۔ کتنی سرعت سے وہ ان کے لیے بیگانہ ہوا۔ کتنی عجلت کے ساتھ وہ اس سے جدا ہوتے۔

پہلے ہی وہ گھٹ چھنٹ کر پانچ رہ گئے تھے۔ اب چار رہ گئے۔ حبیب ان سے کٹ چکا تھا۔ حبیب سے وہ کٹ چکے تھے۔ اب وہ ان کے لیے ایک اجنبی تھا۔ پہلے بھی تو یہی ہوتا رہا تھا۔ ساتھی ان سے کٹتے گئے اور اجنبی بنتے گئے۔ بس اچانک کوئی ایک کٹتا اور اچانک اجنبی بن جاتا۔ مگر جب پانچ رہ گئے تو یوں نظر آ رہا تھا کہ یہ یک جان پانچ قالب ہیں۔ کتنے کتنے مشکل مرحلوں میں وہ قدم سے قدم ملا کر چلے تھے۔ کتنی دیر کتنی دور ساتھ چل کر ایک پھر ٹوٹ گیا اور وہ جو سب سے پختہ دکھائی دیتا تھا۔

"عجیب بات ہے" حمید بولا۔

"ہم یہ سمجھتے رہے کہ سب کچھ باہر سے ہو رہا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ہمیں میں سے ایک....."

"ہاں ہمیں میں سے ایک" جنید نے افسوس بھرے لہجہ میں کہا "اور وہ جس پر ہمیں سب سے زیادہ اعتبار تھا"

"مگر......" حیدر پھر کچھ کہنے لگا تھا۔ کتنی دیر بعد پھر اس نے زبان کھولی تھی۔ مگر کہتے کہتے پھر رک گیا۔ شاید پھر الجھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس واقعہ کا سب سے زیادہ اس نے اثر قبول کیا ہے۔

"ہاں واقعی" حمید بولا "سب سے زیادہ تو ہم نے اسی پہ اعتبار کیا تھا"

"یہ تم لوگوں کی خوش فہمی تھی" اب ہاشم نے زبان کھولی "مجھے تو اس پہ پہلے سے شک تھا"

جنید نے اسے غور سے دیکھا "یہ تو تم اب کہہ رہے ہو"

"میں نے کئی موقعوں پہ اشارہ کیا تھا مگر کسی نے میری بات پر دھیان نہ

دیا۔

http://www.pakfunplace.com

"ہم تو اس کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم میں سب سے زیادہ جوشیلا تو وہی تھا۔ کتنا بے جگرا تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگانے پہ تیار رہتا تھا،" حمید نے یہ بات اس طرح کہی کہ ان کے تصور میں اگلے پچھلے مختلف واقعات گھوم گئے کہ کب کب اس نے جان جوکھوں میں ڈالی تھی، کب کب ایسے کام اپنے ذمے لئے تھے جن میں ذرا سی چوک اسے موت سے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

"مگر ہاشم اس بیان سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ بولا "ایسے لوگ ایسے ہی جانباز نظر آیا کرتے ہیں۔" رک کر بولا "وہ جو اتنا جانباز بنتا تھا اسی سے تو مجھے اور شک ہوا تھا۔"

جمید کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا "انہوں نے ہم پر کتنا اعتبار کیا تھا کتنا بھروسہ تھا انہیں ہم پر۔ اب جب یہ خبر ان تک پہنچے گی تو وہ کیا سوچیں گے..... سمجھیں گے کہ ہم بھی ایسے ہی ہوں گے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا" ہاشم نے اعتماد بھرے لہجہ میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ ہم میں جو ایک مشتبہ شخص تھا وہ دفع ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے پر پورا اعتبار کر سکتے ہیں۔"

"اچھا؟ اس کے بعد بھی؟" حمید کے منہ سے بس بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا وہ کب سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر زبان کھولتے کھولتے رک جاتا کہ بات اس کے لبوں پر آتے آتے الجھ جاتی۔ اب بلا ارادہ اس کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا۔ ایسا کہ سب چونک پڑے۔

ہاشم نے غصے سے اسے دیکھا۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"میں کہتا ہوں،" اب اس کی زبان کھلنے لگی تھی "اس میں اور ہم میں کیا فرق تھا۔ آخر ہم اکٹھے ایک ہی طرح سوچ رہے تھے، ایک ہی نہج پر کام کر رہے تھے اگر اس نے کوئی

گڑبڑ کی ہے تو ہم اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں؟"

جمید اور حمید اس دلیل سے قائل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ مگر ہاشم نے تاؤ کھایا "تو ہم پر شک کر رہا ہے؟"

"کم از کم میں اپنے آپ کو شک سے بالاتر قرار نہیں دے سکتا،"

"بالکل ٹھیک ہے" ہاشم غصے سے بولا "تو تو اس کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا تو اس سے بے خبر تو نہیں ہو سکتا۔"

جمید اور حمید نے چونک کر غور سے جمید کو دیکھا۔

"چپ کیوں ہو گیا،" ہاشم نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔

حمید نے جمید، حمید، ہاشم تینوں کو دیکھا جو اسے شک بھری نظروں سے تک رہے تھے پھر دھیرے سے بولا "ہو سکتا ہے..... شاید میں بھی....."

"تو؟..... تو بھی؟....." جمید اور حمید دونوں کے منہ سے ایک ہی وقت میں ایک ہی جملہ بے ساختہ نکلا۔

"ہاں شاید میں بھی..... اگر اس نے گڑبڑ کی ہے تو میں کیسے یہ دعوے کر سکتا ہوں کہ میں اس میں ملوث نہیں تھا"

یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔ تینوں نے اسے غور سے دیکھا۔ جب وہ چلنے لگا تو جمید اور حمید کچھ پریشان نظر آئے۔

"تو جا رہا ہے؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میرا چلا جانا ہی بہتر ہوگا کہ اس کے نکل جانے کے بعد میری حیثیت بھی مشتبہ ہو گئی ہے"

وہ چلا گیا۔

ایک دفعہ پھر وہ گم سم ہو گئے۔ مگر ہاشم نے جلدی ہی خاموشی کی مہر توڑ دی "تم تو

http://www.pakfunplace.com

اپنی وضعداری میں چپ رہتے۔ میں نے اسے EXPOSE کر دیا۔"

جمید اور حمید دونوں تذبذب میں تھے۔ جمید چپ رہا۔ حمید سے رہا نہ گیا۔ "یقین نہیں آتا کہ وہ بھی۔۔۔۔۔۔"

"اب بھی یقین نہیں آیا"، ہاشم تڑخ کر بولا۔ "اس نے تو خود اعتراف کر لیا۔ اصل میں میں بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت اکھڑا اکھڑا تھا اور تم نے یہ غور نہیں کیا کہ اس سارے عرصے میں وہ بولا ہی نہیں تھا۔ ہر بات سنے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اسے تاڑ لیا تھا۔ کیسا CORNER کیا۔ آخر کو پھٹ پڑا۔"

"اور ہم سے ٹوٹ گیا"، جمید نے افسوس بھرے لہجہ میں آہستہ سے کہا۔

"اچھا ہی ہوا۔ ٹکا رہتا تو ہمارے حق میں یہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے اس طرح گھیرا کہ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ ٹک کیسے سکتا تھا۔ اچھا ہوا۔ اب ہم محفوظ ہیں۔"

ہاشم رواں تھا۔ جمید اور حمید اس کا منہ تک رہے تھے۔ جیسے ان کی مت ماری گئی ہو۔ ایک کے بعد اتنی جلدی دوسرا۔ وہ کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔ ہاشم فاتحانہ شان سے بولے چلا جا رہا تھا۔ ثابت کر رہا تھا کہ وہ دونوں ملے ہوئے تھے۔

"حمید مصلحت کے تحت ٹکا رہنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے EXPOSE کر دیا۔ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ پھر وہ کیسے ٹک سکتا تھا۔ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔ اس کا ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا چلا جانا بہت ہی اچھا ہوا۔"

جمید اور حمید سنے جا رہے تھے۔ قائل ہونے لگے تھے کہ بے یقینی کی ایک لہر آئی اور وہ اکھڑ جاتے۔ ہاشم پھر اسی جوش و خروش سے اپنے استدلال کی تعمیر کھڑی کرتا۔ پھر وہ قائل ہونے لگتے مگر قائل ہوتے ہوتے پھر اکھڑ جاتے۔ وہ بس یقین اور بے یقینی کے بیچ ڈول رہے تھے اسی میں رات ہو گئی۔

"اب سونا چاہیئے۔"

"ہاں مٹی ڈالو اس پہ۔ سوتے ہیں۔"

اس رات وہ جلدی لیٹے کہ اس واقعہ پر سوچ سوچ کر تھک گئے تھے۔ جلدی لیٹے مگر دیر میں سوئے کہ جانے کتنی رات تک ان کے ذہن اسی ادھیڑبن میں رہے۔

دیر سے سوئے، جلدی جاگے، جاگنے کے ساتھ ایک نئی حیرانی۔ جب وہ سوئے تھے۔ تو تین تھے اور جب صبح کو جاگے تو دو رہ گئے تھے۔

"وہ کہاں گیا؟" حمید نے خالی چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون؟"

"ہاشم"

"ہاشم؟" جمید کہ آدھا جاگ رہا تھا آدھا سو رہا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا، اس چارپائی کو دیکھا جس پر ہاشم سویا تھا۔ تھوڑا چکرایا۔ مگر وہ اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سادگی سے بولا "یہیں کہیں ہوگا۔"

حمید نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ واپس آیا۔ بولا۔

"یہاں کہیں نہیں ہے۔"

جمید نے تامل کیا۔ پھر کہا "شاید سیر کو نکل گیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے، مگر جب کبھی وہ صبح کی سیر کے لئے اٹھتا تھا تو ہمیں بھی ضرور جھنجھوڑتا تھا۔"

"ممکن ہے یہ سوچ کر کہ پریشانی میں دیر سے سوئے ہیں جگانا مناسب نہ جانا ہو۔۔۔ کوئی بات نہیں آ جائے گا۔"

اس استدلال سے بظاہر وہ دونوں ہی مطمئن ہو گئے تھے مگر اندر سے دونوں ہی بے چین تھے۔ کتنی بیکلی کے ساتھ انہوں نے اس کا انتظار کیا۔ وقت گزرتا گیا، بیکلی بڑھتی گئی اور وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔

http://www.pakfunplace.com

صبح کا دھندلکا کبھی کا چھٹ چکا تھا۔ دن چڑھ رہا تھا اور گرم ہوتا جا رہا تھا۔ عبید اور حمید پر وقت جتنا گزرتا جاتا تھا بھاری ہوتا جاتا تھا۔ آخر کو حمید سے رہا نہ گیا "اب تو بہت دیر ہو گئی"

"ہاں آنا ہوتا تو اب تک آجاتا۔"

حمید عبید کا منہ تکنے لگا۔ خیال اس کا بھی یہی تھا۔ مگر عبید سے وہ ایسے قطعی لہجہ میں جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

"تو کیا....."

"ہاں شاید اب وہ نہیں آئے گا۔"

"تو گویا وہ بھی....."

"ہاں وہ بھی"

پھر دونوں ہی چپ ہو گئے۔ چپ بیٹھے رہے۔ تذبذب اب تمام ہو چکا تھا اور عبید کو تو بالکل صبر آگیا تھا "خیر اس کے ٹوٹ جانے پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے"

"کیوں؟"

"وہ بول بہت رہا تھا" رکا۔ پھر بولا۔

"ایسے وقت میں جو شخص بہت بولتا نظر آئے اسے شک کی نظر سے دیکھنا چاہیئے"

"اور جو چپ چپ نظر آئے"

عبید نے تامل کیا۔ پھر آہستہ سے بولا "اسے بھی"

"عجیب بات ہے" حمید بڑبڑایا۔

"ہاں عجیب بات ہے۔ مگر شاید اتنی عجیب بات بھی نہیں ہے ایسے میں تو ہر بات ہی سے شک پیدا ہوتا ہے" اور یہ کہتے ہوئے کیسی کیسی گھڑی عبید کے دھیان میں آئی کہ جب ایک دم سے وہ سب ایک دوسرے کے لئے مشکوک ہو گئے تھے کوئی چپ

ہو جانے پر مشکوک ٹھہرا کوئی بول پڑنے پر کسی پہ شک کہ خبر سن کر اتنا بوکھلا کیوں گیا۔ کسی پر شک کہ خبر سن کر اسے سانپ کیوں سونگھ گیا۔ کسی کے باخبر ہونے سے شک پیدا ہوا کہ اسے کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ کسی کی بے خبری نے شک میں ڈالا کہ کہیں وہ جان کر تو بے خبر نہیں بن رہا۔ شکوک و شبہات کی دھند کتنی پھیلی کہ دوست دوست کو نہ پہچان پاتا۔ دماغ کے کسی گوشے میں چپکے سے ایک سوال سر اٹھاتا۔ بات زبان پر آتی اور سرگوشی بن کر کانوں کان پھیلتی چلی جاتی۔

بیٹھے بیٹھے ایک لہر آئی اور عبید اٹھ کھڑا ہوا۔ حمید نے سوال بھری نظر سے دیکھا۔

"کیوں؟..... کہاں؟"

"یہاں سے نکل چلنا چاہیئے ورنہ ممکن ہے کہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں"

حمید چونک پڑا۔ اس پہلو پر تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بس فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

دن بھر چلتے رہے یہ سوچے بغیر کہ کہاں جانا ہے۔ کوئی منزل نظر میں نہیں تھی۔ پھر بھی ایک عجلت میں چلے جا رہے تھے جیسے واقعی کہیں پہنچنا ہے چلے جا رہے تھے۔ دھیان دیئے بغیر کہ کتنا چل لئے ہیں کتنا اور چلنا ہے۔ کتنے سنسان کتنے آباد رستے قدموں نے ناپے۔ قدموں میں بجلی بھری تھی کہ اسی ایک ہی تیزی سے اٹھ رہے تھے اور رستے گرد ہوتے چلے جا رہے تھے۔

"بس اب یہاں ٹھہر جائیں" اچانک عبید نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"لیکن....."

عبید نے حمید کی بات کاٹی "رات تو یہیں گنوانے ہیں۔ صبح کیا کرنا ہے، کدھر جانا ہے، یہ سوچیں گے۔"

تو وہ وہاں پسر گئے اور اب انہیں احساس ہوا کہ وہ کتنا تھک گئے ہیں، ٹانگیں کتنی اکڑ گئی ہیں جیسے یہاں سے اب وہ ایک قدم آگے نہیں اٹھا سکتے۔ حمید نے کمر

http://www.pakfunplace.com

پیچھے لگائی، ٹانگوں کو سیدھا کیا، پھیلایا۔ بولا "آج بہت چلے ہیں۔ تھک کر چور ہو گئے۔"

"اس سے پہلے تو ہم بہت آرام کرتے تھے،" جمید نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

اس فقرے نے عجب اثر کیا۔ دونوں ہی ملول ہو گئے۔ بیتے دنوں کی کلفتیں اور صعوبتیں نظروں میں پھر گئیں۔ کتنے دنوں سے وہ یہ رنج کھینچ رہے تھے۔

"مگر اس سے پہلے ہم اکٹھے چلا کرتے تھے،" جمید نے عجب طرح سے کہا کہ بچھڑنے والے دونوں ہی کو یک دم سے یاد آ گئے۔ وہ بھی جو پہلے بچھڑے تھے وہ بھی۔ جواب آکر بچھڑے۔ کب کب کا ملنا اور بچھڑنا یاد آیا۔ کون کون کس کس موڑ پر بچھڑا اور کس کس طور بچھڑا۔ کوئی تو چلتے چلتے بس پچھڑ گیا اور رہ گیا۔ کسی نے کسی موڑ پہ پہنچ کر اپنا اصلی چہرہ دکھایا اور خندق کے اس پار نظر آیا۔ کوئی بیچ منجدھار میں چھوڑ کر گیا۔ کوئی پانی میں اترنے سے پہلے ہی دوسری طرف بہہ گیا۔ یار حیران کہ کہاں گیا کدھر نکل گیا۔ وسوسے، تجسس، چہ میگوئیاں سرگوشیاں۔ پھر خبر ملنا کہ وہ عزیز خندق کے اس پار پہنچ گیا۔ اچھا؟ واقعی؟ اول حیران ہوتا، پھر ایک دوسرے کو قائل کرنا کہ وہ تو تھا ہی اس تماش کا۔ بس اسی طرح کتنے ہمسفر بچھڑ چکے تھے۔ آگے کتنے قریب تھے۔ اب کتنی دور ہو چکے تھے۔

جمید نے ٹھنڈا سانس بھرا "اب تو ہم دو ہی رہ گئے ہیں،"

"ہاں یار،" جلید افسردگی سے بولا۔ پھر کہنے لگا۔

"ایسے حالات میں دو کا بچا رہ جانا بھی بہت غنیمت نظر آتا ہے،"

"مگر کب تک؟"

جلید جمید کو تکنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا "ٹھیک کہتے ہو۔ آخر کب تک؟"

پھر آپس میں وہ کوئی بات نہ کر سکے۔ بس جیسے ذہن میں ایک پھانس پڑ گئی ہو۔ کب تک۔ آخر کب تک۔ دیر تک دونوں نہ سو سکے نہ بات کر سکے۔ پھانس بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ ہاں آخر کب تک؟ دیر تک جاگا کئے اور کروٹیں بدلا کئے۔ مگر نیند تو سولی پر

بھی آ جاتی ہے۔ مگر وہاں نیند کہاں تھی۔ جلید کو تو بس ایک جھپکی سی آئی تھی۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ یونہی اس نے جمید پر نظر ڈالی جو اس کی طرف کروٹ لئے پڑا تھا اور یونہی اسے خیال آیا کہ اسے تو نیند آ نہیں رہی۔ مگر جمید کس اطمینان سے سو رہا ہے اتنے میں جمید نے کروٹ بدلی۔ اس نے پھر جمید پر نظر ڈالی، شاید وہ جاگ رہا ہے یا شاید سو رہا ہو اور سوتے سوتے کروٹ بدلی ہو۔ اس نے ایک مرتبہ پھر جمید پر نظر ڈالی۔ غور سے اسے دیکھا یہ جاننے کے لئے کہ وہ واقعی سو گیا ہے یا جاگ رہا ہے اگر وہ جاگ رہا ہے تو یہ کیوں ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے کیوں؟ اور ایک شک کے ساتھ اس نے پھر جمید کا جائزہ لیا۔ شاید سو ہی رہا ہو۔ میرا یہ محض وہم ہے کہ وہ جاگ رہا ہے لیکن اگر وہ جاگ رہا ہے اور ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے تو یہ تو شک میں ڈالنے والی بات ہے اور اس کے اندر شک تقویت پکڑتا چلا گیا۔ دماغ میں ایک اندیشہ جاگا، کہیں یہ نہ ہو کہ جب صبح میں اٹھوں تو اپنے آپ کو اکیلا پاؤں۔ اس خیال نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ اکیلا رہ جانے کا خیال بھی کتنا خوف بھرا ہوتا ہے۔

اچانک اسے کتنا ڈر لگنے لگا تھا۔ اگر میں اکیلا رہ گیا تو۔۔۔۔ نہیں۔ اس نے فوراً ہی اپنے اس خیال کی تردید کی۔ جمید ہاشم نہیں بن سکتا۔ ہاشم کے تو شروع ہی سے تیور اور قسم کے تھے۔ آدمی ہی وہ اور طرح کا تھا۔ جمید ویسا آدمی نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی کہ لے دے کے ایک رفیق رہ گیا ہے اس پر بھی وہ شک کرتا ہے وہ بہت کمینہ آدمی ہے۔ مگر پھر اس نے اپنی کمینگی کے لئے ایک عذر بھی تراش لیا۔ رفیقوں کی دغا نے مجھے شکی المزاج بنا دیا ہے۔

جلید پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ جمید نے پھر کروٹ لی اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ جمید کی طرف دیکھا جس نے کروٹ بدل کر پھر اس کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔ گمان تو اسے پہلے ہی ہوا تھا۔ اب یقین آ چلا تھا کہ جمید سویا نہیں ہے۔ ظاہر کر رہا ہے کہ سو گیا ہے اس کے ساتھ ہی اسے جمید کا فقرہ یاد آیا۔ مگر کب تک؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جمید بھی اب ڈانواڈول

http://www.pakfunplace.com

ہے اچھا حمید بھی اس خیال کے ساتھ وہ کتنا افسردہ ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اپنی اس بدگمانی پہ قابو پا لے۔ حمید اور طرح کا آدمی ہے، ہاشم نہیں ہے سیدھا اور کھرا آدمی ہے۔ وہ گویا اپنے وسوسوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اپنے وسوسوں کے ساتھ وہ بہت لڑا۔ بہت کشمکش کشتا ہوئی۔ مگر بے خوابی سے اس کے وسوسے طاقت پکڑتے چلے گئے اور وہ کمزور پڑتا چلا گیا۔

وہ اپنے وسوسوں کے نرغے میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ مجھے آج کی رات سونا نہیں چاہیئے۔ سویا مویا برابر۔ بے خبری میں تو نہیں مارا جانا چاہیئے۔ ہاشم نے آخر ہماری نیند ہی سے فائدہ اٹھایا تھا، نہیں مجھے جاگتے رہنا چاہیئے۔

رات بھر جاگتے رہنے کے ساتھ وہ دور دور کی باتیں دھیان میں لایا۔ کوئی نیا سا خیال۔ کوئی عجب سی تجویز، جو بھی خیال اس کے ذہن میں آتا اسے وہ دیر تک پکاتا۔ اس میں تفصیلات کا رنگ بھرتا چلا جاتا۔ اسی عالم میں ایک خیال اسے اور آیا۔ حمید کو کیوں موقع دیا جائے کہ میرے ساتھ وہ کرے جو ہمارے ساتھ ہاشم نے کیا تھا۔ کیوں نہ میں خود ہی..... ہاں بالکل جب سب ہی نے یہ کیا ہے تو میں بھی..... اور حبیب تو ہم سب میں سب سے بڑھ کر صاحب کردار سمجھا جاتا تھا۔ اگر حبیب یہ کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ اس خیال کی رو میں وہ بہنے لگا تھا کہ اچانک اس نے اپنے آپ کو تھاما۔ نہیں یار، کسی کو قائم بھی رہنا چاہیئے۔ جیسے اچانک اس کے وسوسے دور ہو گئے۔ اپنے آپ سے شرمندہ سا تھا۔ عذر کرنے لگا کہ بس یونہی مجھے ایک خیال سا آیا تھا اور پھر اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ایسا خیال مجھے مغلوب نہ کر لے۔

حمید نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی اور پھر اس کے کان کھڑے ہوئے وہ سوتا سا بن گیا۔ دیکھوں تو سہی وہ کرتا کیا ہے۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے بے سدھ سو رہا ہے۔ مگر جب حمید نے کوئی کروٹ نہ لی تو اس کی طرف سے بے تعلق ہو کر سوچنے لگا کہ تھوڑا سو لینا چاہیئے

پتہ نہیں کل دن کس طرح گزرے اور رات کہاں آئے۔ کم از کم تھوڑی سی نیند تو لے لے، ہی لینی چاہیئے اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ آخر وہ جاگ کیوں رہا ہے۔ حمید کی نگرانی کرنے کے لئے؟ اور اپنی نگرانی؟ اسے خیال آیا کہ ابھی وہ بھی تو ڈانوا ڈول ہو گیا تھا۔ ایسے عالم میں آدمی کو دوسروں سے زیادہ اپنی نگرانی کرنی چاہیئے۔

حمید واقعی جاگ رہا تھا بیچ بیچ میں اس کی آنکھ ضرور لگی۔ مگر صرف آنکھ۔ دماغ نہیں سو رہا تھا۔ دماغ نہ سوئے تو آنکھ کتنی دیر تک لگی رہ سکتی ہے۔ آنکھ لگی اور کھلی — بس پھر بار بار کوشش کرتا تھا کہ دماغ سے سارے خیال نکل جائیں اور وہ سو جائے۔ کتنی مرتبہ اسے گمان ہوا کہ اس نے اچھے برے خیالوں کو کال باہر کیا ہے اب نیند آ جائے گی۔ دیر تک ایسے پڑا رہا۔ جیسے بس نیند آنے لگی ہے، آ رہی ہے، آ گئی ہے مگر پتہ چلتا کہ جنہیں نکال باہر کیا وہ سب پھر اندر گھس آئے ہیں اور دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ پھر کروٹ لینی، جیسے کہ وٹ لینے سے دماغ سے اچھے برے خیال رخصت ہو جائیں گے اور نیند کے لئے رستہ صاف ہو جائے گا۔

کروٹیں لیتے لیتے اسے احساس ہوا کہ حمید بھی سویا نہیں ہے۔ اچھا میں سمجھ رہا تھا۔ کہ سو گیا ہے۔ جاگ رہا ہے تو ظاہر کیوں نہیں کرتا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر خیر اس نے اپنے اس خیال کو زیادہ طول نہیں دیا۔ وہ اس وقت اپنے کسی بھی خیال کو طول دینا نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس وقت سونے کی فکر تھی۔ مگر خیال خود بخود طول پکڑتے چلے جا رہے تھے۔ اور پھر اسے گمان گزرا کہ حمید نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اس نے کئی بار اس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ پہلے گمان ہوا۔ پھر کروٹ لیتے ہوئے اس نے حمید کی طرف اڑتی سی نظر ڈالی اور پایا کہ واقعی وہ تو اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ کیا میں بھی مشکوک ہو چکا ہوں۔ اس نے اس خیال کو بہت رفع دفع کرنا چاہا۔ مگر اپنی ہر کروٹ کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ حمید چوکنا ہو گیا ہے۔

حمید نے ایک بار پھر کروٹ لی اور ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ حمید اس کی کروٹ

http://www.pakfunplace.com

پر چوکنا ہوگیا ہے وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا "جمید"

جمید یہ ظاہر تو نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر پھر بول ہی پڑا "ہوں" اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا "یار نیند نہیں آ رہی"، پھر تھم کر بولا "تم تو سو گئے تھے؟"

"نہیں۔" جمید نے روکھا سا جواب دیا۔

"یار رات بہت لمبی ہوگئی۔ جمید نے جماہی لی۔

جمید نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور سنجیدگی سے مخاطب ہوا "جمید"

"ہاں، کیا بات ہے" جمید نے غور سے جمید کو دیکھا۔

"تمہیں میرے بارے میں کوئی شک ہے؟"

جمید جسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو سٹپٹایا۔ پھر سنبھلا۔ آہستہ سے بولا "ہاں۔ تمہارے بارے میں بھی اور اپنے بارے میں بھی"

جمید اس کی صورت تکنے لگا۔ چپ رہا پھر دبے لفظوں میں بولا "شاید میرا بھی یہی قصد ہے"

حصار

"تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا" ہاں اسے اپنے والد یاد ہیں، پھر؟ اس قصے میں اپنے والد کا حوالہ اسے پسند نہیں آیا تھا مگر میر صاحب کا تو طریقہ ہی یہ ہے کہ اپنی بات سچ ثابت کرنے کی خاطر خود یعنی شاہد بن جاتے ہیں یا کسی دوسرے کو بنا لیتے ہیں وہ آخری دن تھا۔ حصار نہیں کھینچا تھا۔ آخری تسبیح پڑھتے شک ہوا کہ پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ بس اسی میں دھیان بٹ گیا اور دانہ بھول گئے کہ کونسا ہے.... یہ کیا بات ہوئی۔ اسے اس داستان پہ بالکل اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ سوچا کہ آج تو یہی باتیں ہوتی رہیں گی۔ یہاں سے اُٹھ چلو۔

"میر صاحب، جلالی وظیفہ کسی کا پورا بھی ہوا ہے؟" نعیم نے سوال کیا۔

وہ اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

"سینکڑوں میں کوئی ایک نکل جاتا ہے" میر صاحب رکے، پھر بولے "بھائی جلالی وظیفہ تو جوا ہے۔ بس اندھا داؤں سمجھو۔ آدمی یا پیر کامل یا پاگل۔ بندے علی تو ابھی تک جیتے تھے۔ سب نے انہیں دیکھا ہے۔ بیچارے اسی میں پاگل ہوئے۔ انتالیس دن خیریت سے گزار دیئے۔ چالیسواں دن بھی خیریت سے گزر چلا تھا۔ آخری تسبیح کے دو دانے باقی تھے..... لو صاحب ننانوے دانے پہ بھر گئے بس یوں لگا کہ انگلیوں میں کھجورا ہے۔ ہڑبڑا کے انگلیوں کو جھٹکا۔ تسبیح جانماز سے پرے جا گری.... بس اسی میں دماغ چل بسا پاگل ہوگیا۔ ہر وقت انگلیوں کو جھٹکتے تھے" میر صاحب چپ ہوئے، پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولے "بھائی یہ تو اندھا داؤں ہے جو نکل گیا وہ پیر کامل۔ جو رہ

http://www.pakfunplace.com

گیا وہ پاگل۔"

اس نے پھر اُٹھنے کی ہمی باندھی۔ یہاں تو یہی باتیں ہوتی رہیں گی۔

"میر صاحب بعض عامل ہوتے ہیں کہ جس چیز کو کہو فوراً حاضر کر دیتے ہیں"، نعیم نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

"سفلی عمل"، میر صاحب بولے۔

"اچھا؟"

"ہاں آں تھے ایک ایسے عامل کتے کی قبر کے پاس والی املی کے نیچے پڑے رہتے تھے ہم اس زمانے میں بچے تھے۔ ہم کئی لڑکے ان کے پاس پہنچ گئے کہ شاہ جی گلگلے کھائیں گے۔ شاہ جی نے انگلی اُٹھائی۔ لو صاحب گرم گرم گلگلوں سے بھری ٹوکری سامنے آگئی سب نے جی بھر کے کھائے۔ جب واپس ہونے لگے تو محلہ میں کیا جھنگن چلاتی پھر رہی تھی کہ میں نے بچوں کے لئے گلگلے پکائے تھے ایک ننگ دھڑنگ لنگوٹ بند مردوا چوکے سے گلگلوں کی ٹوکری اٹھا کے لے گیا۔ بس کیا پوچھتے ہو بہت طبیعت خراب ہوئی۔"

"حد ہو گئی"، نعیم بولا۔

وہ انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

نعیم نے اس کی طرف دیکھا "ابھی سے؟"

"نیند آ رہی ہے"، اس نے ہلکی سی جماہی لی۔

"یار آج میری طرف نہ سو جاؤ۔"

"کیوں؟"

"آج میں اکیلا ہوں۔ گھر سے سب لوگ گئے ہوئے ہیں اوپر سے میر صاحب نے یہ باتیں سنا دیں۔ اب رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ ویسے تمہارے گھر بھی کون بیٹھا

ہے جو تمہارا انتظار کرے گا میری طرف چلے چلو۔"

"نہیں بھئی"، اس نے مختصر سا جواب دیا اور چل پڑا۔

"سفلی عمل میں پاک نجس کی تمیز نہیں ہوتی اور بھائی اب تو سفلی عمل ہی رہ گیا ہے۔"

میر صاحب کی آواز رفتہ رفتہ پیچھے رہ گئی۔ وہ میر صاحب کی دکان سے چل کر نظیرا کی دکان پر رکا۔ سگریٹ خریدے۔ سگریٹ کی ڈبیا کھولتے ہوئے اچٹتی سی نظر سڑک پر ڈالی۔ بازار ابھی چل رہا تھا۔ گاڑی شاید آگئی تھی کہ سواریوں سے بھرے کئی تانگے آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ بازار کی بھیڑ کے باعث رفتار ان کی اک ذرا سست ہو گئی تھی۔ بھیڑ دکانوں پر تو ایسی نہیں تھی مگر چلتے پھرتے لوگ بہت خاصے دکھائی دے رہے تھے۔ دکانوں کے تھڑوں اور تپائیوں پر جم کر بیٹھنے والوں کی گرم گفتگو اس پر مستزاد تھی۔ اس سب کی وجہ سے بازار میں ہلکی ہلکی گرمی اور روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ سگریٹ کی ڈبیا کھول کر اس نے سگریٹ نکالا، منہ میں لگاتے ہوئے اسے لٹکی ہوئی سلگتی رسی سے سلگایا۔

موڑ مڑ کر وہ پرانی سڑک پر ہو لیا۔ جگمگ دکانیں پیچھے رہ گئی تھیں اور شور بازار کا دوسری دنیا سے آتا معلوم ہوتا تھا۔ دور دور کھڑے بجلی کے کھمبے خاموش سڑک پر اجالا ضائع کر رہے تھے۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور اس ٹھنڈی رات کی نم فضا میں دھواں بکھیرتے ہوئے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ وہ میر صاحب کی دکان کی فضا سے باہر نکل آیا تھا۔ یوں اسے میر صاحب کا فقرہ نادانستہ پھر یاد آگیا تھا۔ مگر اب اس کے ساتھ ناخوشگواری کا احساس شامل نہیں تھا۔ "تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟" انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔ "بھلا یاد کیوں نہ ہوتے" اور سفید داڑھی والا اجالا بڑا سا چہرہ اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ گزرے دن اب خواب سے لگتے تھے۔ عجب مفلسی کے دن تھے۔ کبھی قرض ادھار سے کبھی گھر کی چیزیں گروی رکھ کے گھر کا خرچ چلایا جاتا اور کسی طور پر پورا نہ ہوتا۔ بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے جلالی وظیفہ پڑھنا

http://www.pakfunplace.com

شروع کر دیا۔ اوپر والے کمرے میں دن دن بھر جانماز پہ بیٹھے رہنا، نہ ہنسنا نہ بولنا، خیالوں میں گم گھر ٹاؤں پہنے گھڑی دو گھڑی کے لئے باہر آنا اور اہلی دال روٹی کھانا، ترکِ حیوانات کے باعث گوشت گھی دودھ سے پرہیز تھا پھر اندر جا کر دروازہ بند کر لینا۔ چالیسویں دن جب تیسرا پہر جاتا تھا اور دھوپ کم کم سب سے اوپر والی منڈیر پر باقی تھی، سر برہنہ دونوں ہاتھوں میں کھلا قرآن لئے، بغل میں عصا پیروں میں کھڑاؤں کمرے سے نکلے "یہاں سے نکل چلو"، مگر بھر کی پریشان نظریں دہشت زدہ چہرے پہ ان کے جم گئیں، مگر کسی کو کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا جیسے بیٹھے تھے ویسے کھڑے ہوئے اور گھر سے گھبرائے ہوئے مگر چپ چپ پڑوس میں نقی حسین کے گھر چلے گئے۔ نقی حسین کے گھر رات گئے تک کوئی نہیں سویا جب اونچی آواز میں باتوں کا تار ٹوٹا اور ایک ایک کر کے گھر والے سوتے گئے تو پھر نقی حسین کی بیوی اور اس کی والدہ دبی دبی آواز میں باتیں کرنے لگیں "میں تو جانوں انہوں نے حصار نہیں کھینچا تھا"، نقی حسین کی بیوی کہہ رہی تھیں اور پھر رفتہ رفتہ اسے بھی نیند آ گئی۔ رات گئے آنکھ اس کی پھر کھل گئی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ بس والد اس کے جانماز پہ بیٹھے سامنے قرآن کھولے اونچی آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ وہ ڈرا ڈرا اُٹھا، نالی پر جا کر پیشاب کیا اور چپکے سے کچھ ڈرتے ہوئے باہر جھانک کر دیکھا۔ گلی خالی، گھر میں، چھت پہ صحن میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، دروازہ بند، باہر سے تالا بڑا سا پڑا ہوا۔ دل اس کا دھڑ دھڑ کرنے لگا..... وہ چونک پڑا اور جلدی جلدی چل کر پرانی سڑک سے کھڑکی والی گلی میں مڑ لیا۔

کھڑکی والی گلی میں مڑتے ہوئے قدم اس کے زیادہ تیزی سے اُٹھنے لگے تھے۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ماسٹر امتیاز علی کا دروازہ ضرور چوپٹ کھلا تھا مگر اندر باہر اندھیرا ہی اندھیرا۔ کیا گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے؟ مگر پھر اسے مقفل ہونا چاہیئے تھا۔ نظر اس کی وہاں سے اُٹھ کر قدیر کے بالائی کمرے پر گئی جس

کے شیشوں سے روشنی چھن کر سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ قدیر امتحان کی خاطر یوں راتوں کو نہ جاگتا تو اس گلی میں تو بالکل ہی اندھیرا رہا کرتا، اندھیرا اور خاموشی۔ صرف اس کے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی اور اس نے اپنی چاپ سے چونک کر چال سست کر دی۔

کھڑکی والی گلی سے وہ اس انگلی ایسی پتلی گلی میں داخل ہوا جس کے بیچوں بیچ ایک نالی چلی گئی تھی اور پرلے نکڑ پر ایک دھندلے قمقمے والا کھمبا کھڑا تھا جس کی روشنی میں اسے ایک شخص کمبل اوڑھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جب وہ شخص اس کے قریب پہنچا تو یہاں وہ اجالا نہیں تھا، پھر بھی اس نے کمبل منہ تک لپیٹ رکھا تھا، وہ شخص سائے کی شال پاس سے گزر گیا۔ اس کے گزر جانے پر اسے کریدسی ہوئی کہ آخر یہ کون شخص تھا۔ مڑ کر دیکھا تو گلی خالی پڑی تھی۔ اتنی جلدی وہ گلی سے گزر گیا؟ اسے کچھ تعجب ہوا سوچا کہ کیوں نہ پلٹ کر گلی کے کنارے پہ پہنچ کر اسے دیکھ لیا جائے مگر پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ یہ تو بڑی بے تکی بات ہے اور اس نے اپنی چال تیز کر دی۔

اس پتلی انگلی ایسی گلی سے گزر کر جب اس نے قاضیوں والی گلی میں قدم رکھا تو تھوڑی ڈھارس ہوئی۔ اس نسبتاً چوڑی گلی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دور تک کھمبے کھڑے تھے جن کی روشنی سے ساری گلی منور تھی۔ تھوڑی دور چلا ہوگا کہ پیچھے قدموں کی چاپ اقدموں کی چاپ کے ساتھ دو آدمیوں کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ جی میں آئی کہ پیچھے مڑ کر دیکھو تو سہی کہ کون لوگ ہیں۔ مگر فوراً کے فوراً ارادہ ترک کر دیا۔ ہوگا کوئی، اپنی بلا سے۔ ہاں پیچھے کان لگا کر یہ ضرور اس نے سننے کی کوشش کی کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ مگر جیسے وہ کوٹ یا کمبل کے اندر منہ دیکھ کر باتیں کر رہے ہوں، ایک لفظ بھی تو ان کے پلے نہیں پڑا۔ پھر وہ قدم کسی درمیان میں کٹنے والی گلی میں مڑ گئے کہ ساتھ اس کے قدموں کی چاپ بھی گم ہو گئی۔ پھر دور بہت پیچھے کسی دروازے پر دستک ہوئی کہ وہ فوراً کھلا اور کھل کر زور سے بند ہو گیا۔ تب اچانک اسے احساس ہوا کہ سب گھروں کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور

http://www.pakfunplace.com

وہ باہر گلی میں اکیلا چل رہا ہے۔ اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیئے۔ رات بہت ہو گئی ہے، جلدی گھر پہنچنا چاہیئے۔ لمبے ڈگوں کے ساتھ ہمراہ چلتی پرچھائیں بھی تیزی سے حرکت کرنے لگی۔ جلدی جلدی لمبی ہوتی چلی جاتی، پھر چھوٹی ہونے لگتی، چھوٹی ہوتے ہوتے اس کے قدموں سے لپٹتی اور پھر پیچھے پھیلتی چلی جاتی، لمبی ہوتی جاتی۔ یہ اتنی بڑی پرچھائیں میری ہے؟ ایک اڑتا سا خیال پرچھائیں کی مثال ذہن میں آیا اور گزر گیا۔ آپ ہی آپ وہ آہستہ چلنے لگا۔ اسے تھوڑی سردی لگنے لگی تھی اور انگلیاں تو بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھیں سردی ناخنوں اور پوروں سے چڑھتی ہے، آدمی کے پاس دستانے ضرور ہونے چاہئیں۔ جاڑے کی راتوں میں سکڑتے ہوئے بندے علی اسے الل ٹپ یاد آ گئے کہ کسی بھی گلی کے نکڑ پر، کسی سڑک کے موڑ پر اچانک نظر آ جاتے کبھی کوئی پھٹا ٹوٹا کمبل لپیٹے کبھی کمبل غائب، خالی کرتہ پائجامہ سر پہ میلی سی ٹوپی، مگر سینے ہاتھ کی انگلیاں ہر صورت جھٹکتے جھاڑتے ہوئے، کبھی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے کبھی گم سم اپنے آپ میں کھوئے ہوئے جیسے باقی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہ رشتوں کا جہان بھی کیا تنگ ہے کہ قدم ذرا غلط پڑا اور آدمی اس سے باہر پھر وہ خود ایک جہان ہوتا ہے، بکھرے رشتوں کا خود مختار جہان، جہاں تسبیح کھنکھجورا اور کھنکھجورا تسبیح ہوتی ہے۔۔۔۔

"تو شہزادے کے سر میں ہر وقت درد رہے۔ حکیموں، طبیبوں، ویدوں نے سب علاج کر دیکھے پر کوئی علاج نہ لگے۔ تب شاہی حکیم نے کہ سب حکیموں کا استاد تھا یہ کہا کہ میں شہزادے کی کھوپڑی کھول کے دیکھوں گا۔ تو اس نے کیا کیا کہ شہزادے کو بے ہوشی کی دوائی پلائی اور تیز تلوار سے اس کی کھوپڑی ٹوپی کی طرح اتار لی۔۔۔۔"

"کھوپڑی؟"

"ہاں بیٹا حکیم نے شہزادے کی کھوپڑی جو اتاری تو کیا دیکھے ہے کہ مغز میں کھنکھجورا پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔۔۔۔"

"کھنکھجورا؟"

"ہاں بیٹا کھنکھجورا۔ اب حکیم شش و پنج میں نکالوں کیسے اور دیر کرے تو شہزادے کی جان کا خطرہ۔ تو اس کے شاگرد نے کہا کہ یا استاد گستاخی معاف، آگ منگاؤ، آگ کے ساتھ چمٹی منگاؤ، چمٹی سے ایک دہکتا انگارہ پکڑو، انگارہ پکڑ کے کھنکھجورے کی پشت پہ رکھ دو۔ تو جیا حکیم نے یہی کیا۔ بس کھنکھجورے نے تڑاپ کے پنجے چھوڑ دیئے۔۔۔۔" ایک بلی جھرجھری کے ساتھ وہ چونک پڑا۔ قدم اس کے تیز تیز اٹھنے لگے۔

وہ اپنے آپ سے خفا خفا چل رہا تھا۔ آخر یہ بھولے بسرے قصے جن کا کوئی سر پیر نہیں کیوں یاد آ رہے ہیں۔ کھنکھجورا کہیں دماغ کے اندر ہو سکتا ہے؟ آخر کیسے اور کیوں؟ اندر تو وہ پیدا ہو نہیں سکتا، باہر ہی سے جائے گا۔ مگر کس راستے سے؟ کان کے راستے سے؟ جیسے اس لڑکی کے دماغ میں جس کا سر ہر وقت دکھا کرتا تھا ایک ننھی کنسلائی کان کے رستے داخل ہو گئی تھی اور پھر کنسلائی سے کنسلائی اور کنسلائی سے کنسلائی پیدا ہوتی کہ دماغ میں کنسلائیاں ہی کنسلائیاں رینگنے لگیں۔ اس نے گجگجاہٹ کے احساس کے ساتھ سر کو ذرا جھٹکا۔ لاحول ولا قوۃ، یہ کیا کم مضحکہ خیز کہانی ہے۔ اس کا بس چلتا تو اس وقت اپنے دماغ میں کنجی لگا دیتا۔ مگر دماغ میں کنجی نہیں لگائی جا سکتی اور خیال کے ہزار پیر ہوتے ہیں کہ بے آہٹ رینگتا کبھی کان کے راستے کبھی آنکھ کے سہارے دماغ کے اندر داخل ہوتا ہے اور اندھیرے میں چھپ بیٹھتا ہے۔ اسے اپنے آپ پہ غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں پیر صاحب کی دکان پہ بیٹھ کر عقل سے خارج باتیں اور فرضی قصے سنتا ہے آخر یوں وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟ ــــ اندھیرے میں ایک ساتھ سیاہی کا ایک تودا اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ ٹھٹھک گیا اور چیخ بس منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اسے رمضانی پہ غصہ آنے لگا کہ کمبخت بیچ گلی میں بھینس کو باندھ دیتا ہے۔ شاید یہ غصے ہی کا اثر ہو کہ بدن اس کا کچھ کانپنے لگا تھا یا شاید سردی کا اثر ہو؟ ویسے تھوڑا تھوڑا پسینہ بھی آ گیا تھا اور دل بلاوجہ دھڑکنے لگا تھا۔ سردی تو اسے اب مطلق نہیں لگ رہی تھی بلکہ اس کا تو یہ دل چاہ

http://www.pakfunplace.com

رہا تھا کہ گرم کوٹ ہی کے نہیں قمیص کے بٹن بھی کم از کم اوپر والا بٹن ضرور کھول دے تاکہ تنگ کالر جو اس گھڑی زیادہ تنگ لگ رہا تھا ڈھیلا ہو اور گلے اور گردن کو کچھ سکون ملے۔

قاضیوں والی گلی سے تیز قدم اُٹھاتا ہوا گویا چل نہیں بھاگ رہا ہے وہ پتھر والے کنوئیں پر، پتھر والے کنوئیں کے پاس سے گزر کر شیخ جی کی ٹال کے سامنے سے نکلتا ہوا وہ تیزی سے اپنی گلی میں مڑ گیا۔ مگر وہ اتنا تیز کیوں چل رہا ہے؟ اس نے اپنی چال سست کر دی۔ یوں بھی اسے اطمینان سا ہو گیا تھا جیسے گرجتے بادلوں اور گھرتی گھٹا والے آسمان سے بچ کر وہ چھت کے سائے میں آ گیا ہو۔ گلی خالی اور خاموش تھی، ساتھ میں پرسکون بھی۔ روشنی جو قاضیوں والی گلی کے آدھے رستے پر پہنچ کر ساتھ چھوڑ گئی تھی پھر واپس آ گئی تھی اور اس کے مکان کے بالکل برابر بجلی کے کھمبے کے نیچے اجالے کا ایک تھالا چھلک رہا تھا۔ قدموں کے ساتھ دل کی چھال اور سانس کی رفتار بھی معمول پر آ چکی تھی۔ اطمینان سے چلتا ہوا وہ اپنے دروازے پر پہنچا، تالا کھولا، بجلی جلائی اور کمرے میں، جو بیٹھک بھی تھا اور خوابگاہ بھی قدم رکھا۔

کپڑے اتارتے اتارتے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر بستر پہ نظر کی۔ بستر خالی تھا۔ ہاں بستر کے پائنتی دیوار کے سوراخ میں وہی چوہا جو اس کمرے میں کبھی آزادانہ کبھی چوری چھپے گھومتا نظر آتا تھا داخل ہو رہا تھا کہ دم اس کے سوراخ میں گم ہو جانے کے بعد بھی لہراتی رہی اور جسم میں اس کے اک ہلکی جھرجھری پیدا کر کے آہستہ سے اوجھل ہو گئی۔ کپڑے اتارنا بھول کر وہ بستر صاف کرنے لگا۔ زور زور سے چادر جھاڑی، جھاڑ کر بچھائی، لحاف کو جھاڑا، تہہ کر کے رکھا۔ تکئے کا غلاف اتارا، اتار کر جھٹکا اور قرینے سے سرہانے جمایا۔

نیند آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے اُڑتی سی پلنگ کی پائنتی سے ادھر کے سوراخ پہ ڈالی اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میر صاحب کی بات پھر یاد آ گئی "تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انھوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا؟"

اور قرآن شریف پہ جھکا ہوا وہ سفید داڑھی والا پریشان چہرہ تصور میں پھر ابھرنے لگا اور وہ گھر بھی جس میں کئی دن تک تالا اور اندھیرا پڑا رہا تھا۔ پھر جب واپس ہوئے تو ڈرے ڈرے سے۔ ویسے بالائی کمرے میں اس کے بعد بھی تالا پڑا رہا تھا۔ باہر تالا اور اندر اندھیرا پڑا رہتا اور صحن میں کھلنے والی کھڑکی جو وظیفے کے ختم کے دن کھلی رہ گئی تھی کھلی پڑی رہتی اور کسی کسی جمعرات کو شام پڑے لگتا کہ اندر کوئی چل رہا ہے اور سب کے سب سہم جاتے وہ گھر جس کی چھتیں اور زینے اور کمرے کل تک مانوس تھے اب کتنا ڈراؤنا لگتا تھا اور سگریٹ سلگا کر اس نے اک ذرا عجلت سے میز پہ پڑی ہوئی وہ کتاب اٹھائی جو کل پڑھتے پڑھتے درمیان سے چھوڑ دی تھی۔ اکھڑی اکھڑی طبیعت جمی نہیں تیسرے صفحے پہ بالکل اکھڑ گیا اور کتاب بند کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُٹھتے ہوئے نظر نادانستہ پھر پلنگ کی پائنتی سے ادھر کے خالی سوراخ پہ جا پڑی۔ اتارا ہوا کوٹ کھونٹی سے اتار جھٹ پٹ پہنا، قریب ٹنگا ہوا مفلر کھینچ گلے میں ڈال، بجلی بجھا، کمرہ بند کر باہر نکل آیا۔ بجلی گلی کی گل ہو چکی تھی وہ حیران ہوا کہ ابھی تو وہ بجلی جلتی چھوڑ کر گیا تھا اور ابھی نکلا ہے تو بجلی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ پھر خیال آیا کہ اچھا آج چاندنی رات ہے۔

مفلر گلے سے لپیٹتا لپیٹتا وہ گلی سے باہر چلا۔ روشنی دور تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہاں جابجا چاندنی اتری ہوتی تھی جس کے عکس سے کچھ اندھیرے میں بھی اجالا جھلکنے لگا تھا۔ ساتھ میں کہرے نے مل کر فضا کو دودھیا دودھیا کر دیا تھا۔ سردی اب زیادہ ہو گئی تھی ٹھنڈی ہوتی انگلیاں اس نے مٹھی کی صورت میں سمیٹیں۔ سردی ناخنوں اور پوروں کی راہ بدن میں چڑھتی ہے۔ آدمی کے پاس دستانے ضرور ہونے چاہئیں، اس نے ہاتھوں کو کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیا۔

قاضیوں کی گلی میں مڑتے ہوئے سامنے رمضانی کے دروازے پہ نظر ڈالی جہاں بھینس حسب توقع موجود تھی، مگر بیٹھی ہوئی۔ برابر سے گزرنے پر بھی نہ چونک کر کھڑی ہوئی نہ گردن کو جنبش دی؟ پیہم جگالی کرنے والا جبڑا جیسے سلا ہوا، آنکھیں بند،

http://www.pakfunplace.com

دم ساکت، بس کالونی کا ایک ڈھیر سا رکھا تھا۔ بجلی کے سب کھمبے ٹھنڈے ہو چکے تھے اور گلی خالی اور خاموش تھی۔ بس چاندنی کے عکس سے دمکتا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک سفید بلی، ایک بند دروازے کے برابر دو پیروں پہ بیٹھی اسے دور سے گھور رہی تھی جیسے نیلے کنچے ایسی پتلیاں ٹکٹکی باندھے اسے گھورتی رہیں یہاں تک کہ وہ اس کے برابر آ گیا اور برابر سے گزر کر آگے نکل گیا۔ مگر جب پتلی انگلی ایسی گلی میں مڑ رہا تھا تو اس نے سامنے دیوار پر جہاں چاندنی اتر چلی تھی بلی کی ہلتی پرچھائیں دیکھی جو تھوڑی دیر دکھائی دی پھر اوجھل ہو گئی۔ اس گلی میں چلتے ہوئے اس شخص کا خیال اسے پھر آ گیا جو پاس سے سائے کی صورت گزر گیا تھا۔ آخر کون شخص تھا وہ؟ اتنی دیر کی بات ابھی ابھی کی لگنے لگی وہ ذرا تیز تیز چلنے لگا اور مڑنے میں خاص طور پہ عجلت برتی۔ عجلت سے مڑ کر دور تک نظر ڈالی۔ گلی یہاں بھی خالی پڑی تھی۔ ہاں آخری نکڑ پہ کھلی ہوئی چاندنی میں کتا ایک کھڑی دم اور لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ سنتری کی صورت کھڑا تھا۔ کتے رات میں آدمی کو بہت خراب کرتے ہیں۔ گھر سے چھڑی لے کر نکلنا چاہیے۔ اس کی رفتار پھر آہستہ ہو گئی۔ گلی خاموش تھی۔ ماسٹر امتیاز علی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ قدیر کے بالائی کمرے کی روشنی گل تھی۔ آج شاید وہ سویرے سو گیا تھا۔

گلی کے نکڑ پہ پہنچتے پہنچتے وہ اندھیرے سے اچانک چاندنی میں آ گیا۔ مگر وہ کتا کہاں گیا؟ اس نے ادھر ادھر بہت نظر دوڑائی، کتا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اسے تعجب، تعجب کے ساتھ اطمینان ہوا کیونکہ وہ گھر سے چھڑی لے کر نہیں چلا تھا اور کتے رات کو ہر شریف آدمی پہ جا و بیجا بھونکتے ہیں۔ سائے کی طرح برابر سے گزر جانے والے نامعلوم شخص کا خیال پرچھائیں کی مانند اس کے ذہن میں آیا اور گزر گیا اور چپکے سے ایک سوال اس کے اندر پیدا ہوا کیا بندے علی رات کو بالکل نہیں سوتے تھے؟ لگتا تو ایسا ہی تھا...... اور سیٹی کی آواز پہ اس نے چپل اتار ہاتھ میں لے اور دوڑنا شروع کر دیا۔ سیٹی کی آواز اب کے کہیں قریب سے آئی تھی۔ اور وہ دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب کے بھی اگر سالے ہاتھ سے نکل گئے تو بیٹا ساری رات

چور بنے رہو گے اور گھر میں پٹائی ہو گی سو الگ۔ خیر دروازہ تو اب بھی بند ہو ہی چکا ہو گا۔ اس نے ایک ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے ایک ایک چپل کو اور مضبوطی سے جکڑا اور زیادہ تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ مگر گلی میں مڑتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ پاؤں سو سو من کے ہو گئے کہ بھاگا جائے نہ ٹھہرا جائے۔ بندے علی ماسٹر صاحب کے دروازے کی طرف منہ کیے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور دروازہ بند، گلی خالی تھی۔ آہٹ پہ انہوں نے مڑ کے بڑی بڑی گھورتی آنکھوں سے اسے گھورا۔ پھر انگلیوں کو زور سے جھٹکا اور جلدی جلدی چل کر دوسری گلی میں مڑ گئے اور وہ نہ پلٹ سکتا تھا نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ اونچی دیواروں والی اس گلی کی دونوں طرفیں سنسان رہی تھیں جیسے وہ کسی گہری کھائی میں گر پڑا ہو۔ اس نے رفیا اور رشتے اور دینا کو زور سے آواز دینی چاہی مگر آواز گلے میں پھنس گئی اور سینے پہ بوجھ سا رکھا ہوا...... خیال کا سلسلہ بس آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ سڑک اسی طرح خاموش تھی اور کھلی چاندنی پوری سڑک پہ پھیلی ہوئی تھی۔ قدم اس کے تیزی سے اٹھ رہے تھے اور دل کچھ کچھ دھڑکتا ہوا۔ جاڑا اسے اس وقت بالکل نہیں لگ رہا تھا، بلکہ گرم کپڑے بدن پہ بوجھ بن گئے تھے۔ سر اور کانوں پہ لپٹا ہوا مفلر اس نے ڈھیلا کیا اور کوٹ کے دونوں بٹن کھول دیے۔ اس کے تیز تیز اٹھتے ہوئے قدموں کی چاپ اتنی اونچی تھی کہ وہ خود ہی اس سے ڈر گیا۔ وہ آہستہ چلنے لگا۔ ہم رکاب پرچھائیں بھی آہستہ چلنے لگی۔ اس نے اپنی چاپ اور پرچھائیں سے قطع نظر کر کے سڑک کے نزدیک و دور کا جائزہ لیا۔ سڑک خالی تھی۔ بس کنارے کنارے دودھیا کھمبے چاندنی میں نہائے ہوئے بینائی سے محروم ایک دوسرے سے بے تعلق کھڑے تھے۔ ایک دوسرے سے بے تعلق نابینا کھمبوں کو دیکھ کر اسے اچنبھا ہونے لگا کہ جب روشن تھے تو سڑک کے اس کنارے سے اس کنارے تک ایک رشتے میں کیسے پیوست نظر آتے تھے۔ تو روشنی رشتہ ہے؟ یا رشتوں سے روشنی پیدا ہوتی ہے؟ یعنی جسم اور پرچھائیں کا رشتہ روشنی نے پیدا کیا ہے یا روشنی کو جسم اور پرچھائیں کے رشتے نے پیدا کیا ہے؟ اور قدموں اور چاپ

http://www.pakfunplace.com

کارشتہ؟ چاپ قدموں کی پرچھائیں ہے یا قدم؟ — وہ گڑبڑا گیا جس خیال کا سر پیر نہیں ہوتا اس کے کتنے پیر ہوتے ہیں۔ بے سرپیر کے خیال سے بچنے کے لئے آدمی کو واقعی اپنے گرد حصار کھینچنا چاہیئے ورنہ ہزار پیروں والے وسوسے اور واہمے اس کے گرد حصار کھینچ لیں گے وہ جلدی سے مڑ کر بازار والی سڑک پہ ہولیا۔

بازار جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جاگتا چھوڑ گیا تھا اب سویا ہوا تھا۔ اسے یوں لگا کہ ایک جُگ کے بعد وہ اس بازار میں پلٹا ہے۔ بجلیاں ٹھنڈی تھیں اور خالی سڑک نصف نصف چاندنی اور سائے میں تقسیم تھی کہ ایک طرف کی بند دکانیں اجالے میں اور دوسری طرف کی بند دکانیں اندھیرے میں تھیں۔ اس نے چاندنی چھوڑ کر سائے میں چلنا شروع کر دیا گویا کسی سے چھپ کر چلنا چاہتا ہے۔ مگر چند قدم چلا تھا کہ ایک تھڑے کے نیچے سے تیزی کے ساتھ ایک سیاہ سی شے نکلی وہ گھگھیا کر پیچھے ہٹا۔ پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ تو کتا تھا جو اسے دیکھ کر سڑک پہ آ کھڑا ہوا تھا اور بھونکنے لگا تھا۔ ویسے سنبھل جانے کے باوجود دل اس کا زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں کچھ کچھ کانپنے لگی تھیں اور کتا تھا کہ بھونکے جا رہا تھا۔ لحاف میں لپٹی ہوئی ایک آواز نے اسے دھتکارا اور وہ بھونکنا بند کر کے آہستہ آہستہ غرغر کرنے لگا اور اسے اس وقت تک غور سے دیکھتا رہا جب تک وہ دکان کے سامنے سے گزر نہیں گیا اور وہ گزرا بھی اس چال سے جیسے کتے پہ ثابت کر رہا ہو کہ وہ اس سے بالکل نہیں ڈرا ہے۔ ہاں دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر دکان کی طرف ضرور ڈالی۔ وہاں دکان کے مقفل دروازے سے متصل سائبان کے نیچے ایک چارپائی بچھی تھی جس پہ میلے لحاف میں لپٹا ہوا کوئی پڑا تھا۔ یہ کون شخص ہے جو اس جاڑے میں باہر سوتا ہے؟ دکان والا ہوگا، اس نے سوچا۔ مگر دکان والا ہے تو اندر بھی سو سکتا تھا۔ کون شخص ہو سکتا ہے؟ مارو گولی، ہوگا کوئی۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں قیاس کے اس سلسلہ کو رد کر دیا۔ اسی فیصلہ کن انداز میں اس کے قدم بھی اٹھنے لگے مگر چلتے چلتے اسے شک

گزرا کہ کوئی پیچھے پیچھے آ رہا ہے اور اس شک کے ساتھ دل کی حرکت رکنے لگی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ وہی کتا ہوگا۔ کبھی کبھی کتا بھی تو اس احتیاط سے چلتا ہے کہ اس کی آہٹ آدمی کے قدموں کی آہٹ بن جاتی ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر پھر رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا اپنے خوف کا اعلان کرنا ہے۔ پھر وہ بہت تنگ کرے گا اور اسے یکایک گمان ہوا کہ کیا جبر ہے وہی شخص ہو جو لحاف میں منہ دیئے پڑا تھا۔ ارے نہیں اسے باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ اس جاڑے میں بستر سے اٹھ کر کسی کا پیچھا کرے گا۔ آخر کیوں؟ اور وہ اندھیرے کی سمت سے ہٹ کر چاندنی والی سمت میں آ گیا۔ چلتے چلتے ایک مرتبہ کنکھیوں سے اس نے اس لحاف والی چارپائی کو دیکھنے کی بھی کوشش کی۔ مگر وہ اب اتنا آگے نکل آیا تھا کہ اسے وہ چارپائی نظر نہ آ سکی۔

میر صاحب کی مقفل دکان کے سامنے سے نکلتے ہوئے اسے پھر اپنے والد یاد آ گئے۔ قرآن شریف پہ جھکا ہوا وہ پریشان چہرہ اور وہ تلاوت کرتی ہوئی اکیلی آواز کہ رات کی خاموشی میں سارے گھر میں گونجتی رہتی۔ وہ آواز آوازوں کے جہان سے اب کتنی دور ہو گئی تھی اور وہ اپنا گھر باوجود بولنے چالنے کے کتنا خاموش ہو گیا تھا۔.... اس نے میر صاحب کی مقفل دکان سے نظر ہٹا کر سامنے سڑک کو دیکھا۔ دور سڑک کے نکڑ پہ اندھی اندھی روشنی نظر آئی۔ تو مولوی ٹنٹے کی دکان اب تک کھلی ہے؟ اور اس مشاہدے کے ساتھ اسے اس بازار کے پچھلے دن یاد آ گئے۔ جب رات گئے تک دکانیں کھلی رہتی تھیں اور میر صاحب کی دکان پہ چوکڑی جمی رہتی تھی اور ابے دسے کے نعیم اور خود وہ ان کے سامعین میں ہیں۔ اس خیال سے اس کی طبیعت اداس اداس ہو گئی۔ رہ رہ کر اسے خیال آ رہا تھا کہ اس بازار کو کیا ہو گیا۔ وہ رتجگے کیا ہوتے؟ وہ شب بیدار دکاندار دکانیں بڑھا کر کس کھوہ میں چلے گئے؟ اب صرف مولوی ٹنٹا..... مگر مولوی ٹنٹا تو..... اسے وہ داستان یاد آ گئی کہ مولوی ٹنٹا کی دکان صبح تک کھلی رہتی ہے کیونکہ آدھی رات کے بعد جن اس کی دکان پہ پان اور عطر اور

http://www.pakfunplace.com

اگربتیاں خریدنے آتے ہیں اسے یہ داستان اس وقت بے سروپا نظر آ رہی تھی۔ ایک بھلے مانس کو خواہ مخواہ باؤلا بنانا اس داستان کو رد کرتے ہوئے اس نے تیزی سے قدم اٹھائے اور جلدی جلدی چل کر مولوی ٹنڈا کی دکان پہ جا کر دم لیا۔ خمیدہ کمر، کالی رنگت، گال پچکے ہوئے بڑا سا دہانہ، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے، کلے میں تمباکو والا پان رکھا ہوا جس کے باعث اکثر وہ انگلیوں کے اشاروں اور آنکھوں کی نقل و حرکت کے ذریعے سوال و جواب کرتا۔ اس کی بڑی بڑی گھورتی آنکھوں سے وہ ڈر سا گیا اور بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں دوڑا، کہیں مولوی ٹنڈا خود ہی تو...... ارے نہیں، کیا فضول بات ہے۔ یوں اپنا ذہنی اطمینان کر لینے کے بعد بھی وہ اس کی سوالیہ نظروں سے پیچھا چھڑا رہا۔ سگریٹ تو ابھی ہے، اس نے جیب ٹٹولتے ہوئے سوچا۔ پان۔ ہاں پان کھا لینا چاہیئے۔ "پان،" اس نے کہا۔ مولوی ٹنڈا کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اپنے کام پر لگ گئیں۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی سلگتی رسی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی نظر مولوی ٹنڈا کے جلدی جلدی حرکت کرتے ہوئے سیدھے ہاتھ پر جا پڑی جس کی تین انگلیاں گم تھیں، انگشت شہادت تین چوتھائی، بس انگوٹھا سالم تھا۔ اسے یاد آیا کہ مولوی ٹنڈا جوانی میں شب برات پر پٹاخے بنایا کرتا تھا۔ گولا کستے کستے کنکر نے مرسل سے رگڑ کھائی اور گولا اس طرح پھٹا کہ سوا تین انگلیاں اس کی اپنے ساتھ لے گیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے سلگتی رسی انگلیوں سے چھوڑ دی جو تھوڑی دیر جلتی رہی۔ پھر ساکت ہو گئی۔ اس نے ایک لمبا کش لیا اور دھواں اڑاتے ہوئے پان کے لئے مولوی ٹنڈا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پان منہ میں رکھنے کے بعد اسے اپنی انگلیاں گیلی گیلی لگیں۔ اس نے روشنی کے قریب لا کر اپنی انگلیوں پر نظر کی۔ شاید کتھا بہت پتلا تھا کہ انگلیاں اس کی سب کی گیلی ہو گئی تھیں۔ کتھے دھبوں والی پونچھن سے اس نے انگلیاں صاف کیں، پھر سگریٹ کو انگلیوں میں داب کر ایک لمبا کش لیا اور نیم والی گہری گلی میں اتر گیا۔

اگر انگلیاں اڑ جانے کی وجہ سے اپنا مولوی مولوی ٹنڈا ہو گیا تو جس شہزادے نے رات کے پردے میں آنے والی پھول شہزادی کو پکڑنے کی غرض سے اپنی انگلی تراش لی تھی اسے شہزادہ ٹنڈا کیوں نہ کہا جائے؟ اور یہ پرانے زمانے کے شہزادے بھی عجیب تھے، شب بیداری کا ایک ہی طریقہ جانتے تھے کہ انگلی قلم کی اور زخم پہ پسی ہوئی مرچیں چھڑک لیں کیا انگلی میں زخم پیدا کئے بغیر شب بیداری ممکن نہیں؟ اور کیا یہ بال اور جن شب بیداروں ہی کو نظر آتے ہیں؟ اور کیا مولوی ٹنڈا کی دکان پہ سچ مچ جن عطر اور پان اور اگربتیاں لینے آتے ہیں؟ اور کیا منڈے علی کی انگلیوں میں جو واقعی... اور سوئی ایسے پیروں والے رینگتے ہوئے سوال ایک بے سر پیر کی ابھرتی ہوئی تصویر میں تحلیل ہو گئے۔ چندری حلوائی ایک سرخ منہ والے زرد رنگ سانپ کو دم سے پکڑے دکان سے باہر نکلا۔ دھڑ کے ساتھ زاویہ قائمہ بناتے ہوئے اس لمبے ہاتھ کی انگلیوں نے دم کو جکڑ رکھا تھا اور اسی کی شال لمبے سانپ کے سرخ منہ سے سوئی ایسی زبان چنگاری کی طرح بار بار نکلتی تھی۔ چندری حلوائی اس شان سے پرانے مندر تک گیا اور وہاں اندھے کنوئیں کی من پہ کھڑے ہو کر اس نے اپنا تانا ہوا ہاتھ کنوئیں کے بیچوں بیچ ٹھہرایا اور انگلیاں ڈھیلی کر دیں۔ وہ زرد دم انگلیوں سے پھسل کر کنوئیں کے اندھیرے میں اوجھل ہو گئی..... اس اوجھل ہوتی تصویر کے ساتھ اسے ایک پھریری آئی اور ساتھ ہی وہ منظر یاد آ گیا جب اس نے ننھے کی دیکھا دیکھی چوہے دان میں مقید چوہے کی تاروں سے باہر نکلی لمبی دم پکڑ لی تھی مگر فوراً گھگیا کر چھوڑ دی اور پھر صابن سے خوب مل مل کے ہاتھ دھوئے مگر کئی دن تک اس کی انگلیاں اس گلگلے سے احساس سے اس کی طبیعت میں بد مزگی پیدا کرتی رہیں۔ اور اس یاد کے ساتھ گھگیا ہٹ کی ایک کیفیت پوروں سے شروع ہوئی اور پورے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے سر کو آہستہ سے جھٹکا۔ وہ ان رینگتی یادوں اور سرسراتے وسوسوں کے جال سے نکل کر اطمینان سے چلنا چاہتا تھا۔ گردن پہ پڑا ہوا مفلر اس نے سر اور کانوں پہ اچھی طرح لپیٹا۔ اسے اب

http://www.pakfunplace.com

سردی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی ٹھنڈی ہوتی انگلیوں کی مٹھیاں باندھیں اور جیبوں میں ٹھونس لیں۔ پھر سوچنے لگا کہ مفلر تو موجود ہے ہی۔ کانوں کو ہوا نہ لگے تو آدمی سردی کی سو بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے بس دستانے اور خرید لینے چاہئیں کہ سردی ناخنوں اور پوروں کی راہ بھی چڑھتی ہے۔

نعیم کا گھر اب قریب تھا اور جاڑوں کے لئے جو چیزیں اسے مطلوب تھیں۔ اس کے منصوبوں نے اس کی توجہ کو بہت حد تک جذب کر لیا تھا مگر کوئی گمنام ہزار پا خیال شاید ابھی تک اس کے ذہن کے کسی عقبی گوشے میں چپکے چپکے رینگ رہا تھا کہ طبیعت اس کی پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں اوبڑ کھابڑ خیالوں اور یادوں نے اسے بہت بے مزہ کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ جس خیال کا سر پیر نہیں ہوتا اس کے ہزار پیر ہوتے ہیں جو کبھی کانوں کی راہ اور کبھی آنکھوں کی پتلیوں کے ذریعہ کبھی انگلیوں کی پوروں کے اندھے راستے رینگتا رینگتا دماغ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس نے طے کیا کہ حواس لعنت ہیں۔ وہ کون حکیم تھا جس نے اہلِ نظر کو کچھوے کے نقشِ قدم پہ چلنے کی تلقین کی تھی؟ کچھوا جس کی پشت حصار ہے کہ اس کی بدولت وہ درد والم سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی پشت حصار ہے کہ حصار کا بار اس کی پشت پہ ہے؟ اور اہلِ نظر کچھوے ٹھہرے یا کچھوا اہلِ نظر ہے؟ اور آدمی؟ آدمی تو ظالم و جاہل ہوا کہ بے منت حصار جینا چاہتا ہے بد سوئی ایسے پیروں والے سوال اس کے ذہن میں پھر رینگنے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے قدم تیز کئے اور نعیم کے بند دروازے پر رکتے ہوئے زور سے دستک دی۔

نعیم نے دروازہ کھولا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا۔ "کون؟ ارے تم؟"

"ہاں یار نیند نہیں آ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے خفقان ہونے لگا۔ میں نے کہا کہ چلو نعیم ہی کی طرف چلے چلو۔"

"یار تمہارے دماغ میں بھی کیڑا ہے۔"

"کیا؟" وہ چونک پڑا۔

"ہاں اور نہیں تو کیا۔" نعیم کہنے لگا "جب میں نے کہا تھا تو نہیں ملنے۔ اور اب جب میں سو گیا ہوں تو آگر آدھی رات کو دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ آؤ، اندر چلو۔"

نعیم کے پیچھے پیچھے وہ اندر گیا۔

"کپڑے بدلو اور بس سو جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اس نے کوٹ کے بٹن کھولے۔ مفلر اتار کر الگ رکھا۔ پھر کوٹ اتارتے اتارتے رکا۔ بجلی کے نیچے جا کر کھوئی کھوئی نظروں سے وہ اپنی انگلیاں دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" نعیم نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ انگلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا "مولوی ڈنڈے نے آج کتنا اتنا پتلا کر رکھا تھا کہ میرا سارا ہاتھ کیچڑ سے خراب ہو گیا۔" ایک گھگھیا ہٹ کے ساتھ جیسے انگلیاں اس کی سچ مچ کیچڑ میں سن گئی ہوں اس نے انگلیاں مٹھی کی صورت میں سمیٹیں اور جیب میں ہاتھ ٹھونس لئے اسے وہ فقرہ اڑتا اڑتا سا پھر یاد آ چلا تھا: "تمہیں اپنے والد یاد ہیں انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔"

http://www.pakfunplace.com

نرناری

مدن سندری کتنی خوش تھی کہ دیوی نے اس کی سن لی، نہیں تو بھیا اور پتی دونوں ہی کو وہ کھو بیٹھی تھی۔ بھیا جب سدھارنے لگا تو اس کی خوب بلائیں لیں۔ گوپی نے بھی اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا، دعا دی دعا لی اور چلا گیا۔

گوپی کے چلے جانے کے بعد بھی مدن سندری دیوی کے گن گاتی رہی۔ دھاول اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ دونوں نے مل کر دیوی کی اس آن بان کو یاد کیا کہ برہما، وشنو اور اندر سب اس کی سیوا میں لگے رہتے ہیں اور وہ بھی اپنے بھگتوں پر کتنی کرپا کرتی ہے کہ جب کسی بھگت پہ بپتا پڑتی ہے تو وہ ترت وہاں پہنچ کر اسے سنکٹ سے نکالتی ہے۔

بس انہیں باتوں میں دن بیت گیا رات ہوئی اور دن بھر کی تھکی ہاری مدن سندری سونے کے لئے دھاول کے سنگ آ لیٹی۔ آج اس کی باہنوں میں جسے اس نے کھو کر پایا تھا کتنی چاہت کے ساتھ آئی تھی اور آج ہی اسے ان باہنوں میں سکھ نہ ملا۔ وہ بدن آج اسے انجانا لگ رہا تھا۔ وہ حیران کہ آج اس کے بدن کو کیا ہو گیا۔ اس بدن کو تو اس کا بدن خوب پہچانتا تھا۔ جب دونوں بدن ملتے تو کیسے گھل مل جاتے جیسے جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور وہ ہاتھ کیسی جانکاری کے ساتھ اس گورے گرم بدن کے بیچ یاترا کرتا جیسے اس کے سب بھیدوں کو اس نے بوجھا ہوا ہے اور اس بجلی بھرے ہاتھ کو چھو جانے سے انگ انگ میں ایک لہر دوڑ جاتی اور پورا بدن جاگ جاتا۔ پر آج تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بدن ایک دوسرے کو جانتے ہی نہ ہوں اور وہ ہاتھ جیسے پہلی مرتبہ اس بدن کے بیچ اترا ہو۔ مدن سندری وسوسے میں پڑ گئی۔ کیا یہ وہی بدن نہیں جس سے روز رات کو لگ کر وہ سویا کرتی تھی۔ پھر اتنا انجانا پن کیوں؟ اپنے

وسوسے سے وہ بہت لڑی۔ اپنے آپ کو دیر تک روکتی رہی۔ پر ایک دفعہ بے قابو ہو کر بول پڑی "یہ تو نہیں ہے" اور اس کی باہنوں سے نکل اٹھ بیٹھی۔

"دھاول حیران کہ مدن سندری کو کیا ہو گیا۔ کیا کہہ رہی ہے تو یہ میں نہیں ہوں۔"

"نہیں، یہ تو نہیں ہے" زبان ایک دفعہ کھلی تو بس کھل گئی۔

"سندری ہوش کی دوا لے میں اگر میں نہیں ہوں تو پھر کون ہوں" یہ کہتے ہوئے دھاول اٹھا۔ چراغ جلایا، چراغ ہاتھ میں لے مدن سندری کے پاس بیٹھا اور بولا "لے دیکھ لے۔ بول یہ میں نہیں ہوں"

مدن سندری نے چراغ کی روشنی میں پتی کو دیکھا اور ایسے بولی جیسے اپنے کہے پر شرمندہ ہو، "ہاں ہے تو یہ تو ہی۔"

"اچھی طرح دیکھ۔ پھر بعد میں کسی سندیہہ میں پڑ جائے۔ تو خوب دیکھ لے" دھاول بھی اب اسے زچ کرنے پر اترا ہوا تھا۔

وہ زچ ہو گئی "ہاں تو ہی ہے۔" پر یہ کہتے کہتے اس کی نظر دھاول کے ہاتھوں پر جا پڑی۔ چونک کر بولی "پر یہ ہاتھ؟"

"ان ہاتھوں کو کیا ہوا؟"

مدن سندری نے دھاول کی بات ان سنی کی۔ ان باہنوں کو تکتی رہی "دھاول، یہ ہاتھ تیرے نہیں ہیں۔"

"پھر کس کے ہیں؟" اس نے جل کر کہا۔

پھر کس کے ہیں، یہی تو وہ سوچ رہی تھی، یہ ہاتھ انجانے تو نہیں ہیں۔ مگر دھاول کے بھی نہیں ہیں۔ پھر کس کے ہیں اسی آن ایکدم سے گوپی کا سراپا اس کی نظروں کے سامنے آ گیا "گوپی کے ہاتھ؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور وہ سناٹے میں آ گئی۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ پھر تو اس کا وہ حال ہوا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ گم سم ہو گئی۔ بول تو ایسے جیسے جرم کو قبول رہی ہو "سوامی، مجھ سے ایک چوک ہو گئی۔"

http://www.pakfunplace.com

"چوک؟ کیسی چوک؟"

"بھاری چوک ہوگئی۔" اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"پتہ تو چلے کیا چوک ہوگئی؟"

"سر دھڑ کا گھپلا ہوگیا۔"

"سر دھڑ کا گھپلا؟" وہ بہت چکرایا۔ "اری بھاگوان آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے"

وہ رو پڑی "سوامی! تم مجھے بھاگوان کہتے ہو۔ مجھ سے بڑھ کر دربھاگ کس کے ہوں گے۔ ایک سنکٹ سے نکلی تو دوسرے سنکٹ میں پڑ گئی۔ پھوٹ جائیں یہ نین جنہوں نے پہلے مرے پتی اور بھیا پیارے کے سر دھڑ کو جدا دیکھا اور اب سر دھڑ کا گھپلا دیکھ رہے ہیں اور ٹوٹ جائیں یہ ہاتھ جن سے یہ گھپلا ہوا۔"

دھاول چکرا سا گیا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں مدن سندری کا دماغ چل۔ بچل تو نہیں ہوگیا۔ بولا "اری سر تو میرا کٹا تھا پہ مجھے لگتا ہے کہ سر تیرا پھر گیا ہے۔ سیدھی بات کر نہیں تو میں سچ مچ یہی سمجھوں گا کہ تیری مت ماری گئی ہے۔"

"ہاں میری مت ہی تو ماری گئی تھی۔ ہوا یہ کہ . . . . ." اور یہ کہتے کہتے وہ سارا منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ سندری کی انگناتی، بن دیوی کی مورتی کے سامنے گوپی اور دھاول خون میں لت پت پڑے ہوئے اس طرح کہ دونوں کے سر الگ دھڑ الگ۔ اس کی سدھ بدھ جاتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا۔ کیسے ہوا۔ منہ پیٹنے لگی، نوچنے لگی۔ دم بھر میں آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہہ گئی۔ روتے روتے سامنے جو نظر گئی تو دیکھا کہ خون میں سنی تلوار پڑی ہے۔ خون میں سنی اس تلوار کو دیکھ کر اس کے دماغ میں کچھ اور ہی سمائی۔ یہ میرے دربھاگ ہیں کہ سوامی اور بھیا دونوں جان سے گئے۔ میں ابھاگن اب جی کے کیا کروں گی۔ جس کھانڈے نے ان کا کام تمام کیا ہے، کیوں نہ اسی کھانڈے سے میں اپنا سر کاٹوں اور ان پہ وار دوں یہ سوچ کر اس نے وہ خون میں سنی تلوار اٹھائی۔ ابھی گردن پہ مارنے لگی تھی کہ دیوی کی مورتی سے آواز آئی۔

"ناری کھانڈا پھینک دے۔ تو سچی استری اور پکی بھگتنی نکلی۔ میں تجھ سے پرسن ہوتی۔ سو میں نے تیرے پتی اور بھیا کو جی دان دیا۔ تو ایسا کر کہ منڈ کو رنڈ سے ملا۔ دونوں جی اٹھیں گے" یہ آواز سن کے اس کے تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بس اسی میں گڑبڑا گئی۔ مت پہلے غم سے ماری گئی تھی، اب خوشی سے ماری گئی۔ سوامی، میری مت سچ مچ ماری گئی تھی۔ ایسی گڑبڑائی کہ بھیا کے دھڑ پہ تمہارا مستک ٹکا دیا۔ تمہارے دھڑ سے بھیا کا مستک چپکا دیا۔ پھر جو مجھے سدھ آئی تو میں نے سر پیٹ لیا کہ یہ میں نے کیا کیا۔ غلط کو صحیح کرنے لگی تھی۔ پر جو ہونے والی بات ہو، ہو کر رہتی ہے۔ میں سر دھڑ کو پھر سے جوڑنے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ تم دونوں جی اٹھے اور دونوں کو جیتا دیکھ کر میں خوشی سے ایسی باولی ہوئی کہ یہ بات ہی میں بھول گئی۔ اب یاد آیا ہے تو گڑبڑائی ہوئی ہوں کہ یہ تو بھیا اور پتی کا گھال میل ہوگیا۔"

دھاول نے بات کو ہنسی میں اڑانا چاہا۔ "چل یہ تو اچھا ہی ہوا کہ بھیا اور پتی کا گھال میل ہوگیا۔"

وہ تڑپ کے بولی "پر مجھے یہ چنتا کھائے جا رہی ہے کہ اب میں بہن کس کی ہوں اور پتنی کس کی ہوں۔"

یہ بات سن کر دھاول تھوڑا گڑبڑا گیا۔ اب اسے سوچنا پڑا۔ مگر جلدی ہی اس نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ بولا "اری یہ فیصلہ کرنا کونسی مشکل بات ہے۔ ندیوں میں اتم گنگا ندی ہے۔ پربتوں میں اتم سمیرو پربت۔ انگوں میں اتم مستک۔ دھڑ کا کیا ہے وہ تو سب ایک سمان ہوتے ہیں۔ مانو تو اپنے مستک سے پہچانا جاتا ہے۔ سو تو دھڑ پہ مت جا۔ مستک کو دیکھ کہ وہ میرا ہے۔"

مدن سندری قائل ہوگئی۔ دل میں کہا کہ دھاول ٹھیک کہتا ہے۔ دھڑ کے نہ آنکھ کان ہوتے ہیں، نہ ناک نہ منہ، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو بس دھڑ ہوتا ہے۔ اس نے دھاول کے مستک کو دیکھا اور سب کچھ بھول گئی۔

http://www.pakfunplace.com

وہ دونوں اس دوری کے بعد جیسے بہت پاس پاس آگئے ہوں۔ ایسے ملے جیسے ایک دوسرے میں گھل جائیں گے۔ پر جب وہ ہاتھ بدن پہ آیا تو جانے کیا ہوا کہ وہ پھر بھڑک گئی۔ باہوں سے تڑپ کر نکل گئی۔

"سندری، اب تجھے کیا ہوا؟"

"لجا آرہی ہے۔"

"کس سے، اپنے پتی سے؟"

"نہیں، پتی سے نہیں۔"

"پھر کس سے؟"

رکتے رکتے بولی "دھڑ سے"

"ہے میری دھرم پتنی" وہ پریشان ہوکر بولا "کیا تو پھر میرا سر اور دھڑ الگ الگ دیکھنا چاہتی ہے۔ جان لے کہ جس کا سر اس کا دھڑ۔ سو سر بھی میں، ہوں۔ دھڑ بھی میں ہوں۔"

جب دھاول نے سر اور دھڑ کے الگ الگ ہونے کی بات کی تو مدن سندری بہت دکھی ہوئی، ایک بار اس کی آنکھوں میں وہ منظر پھر گیا کہ دھڑ الگ سر الگ۔ "نہیں نہیں، ایسی بات منہ سے مت نکالو" اس نے تڑپ کر کہا۔ پھر اس نے من ہی من میں طے کر لیا کہ اب وہ اس سر اور اس دھڑ کو ایک جانے گی۔

مدن سندری نے تو طے کر لیا کہ اب وہ اس سر اور اس دھڑ کو ایک جانے گی۔ پر یہ کچھ کہنے کے بعد دھاول دبدا میں پڑ گیا۔ اپنے انگ انگ کو دیکھا، ایک بار، دو بار، بار بار ہے رام۔ کیا یہ میں ہی ہوں۔ پھر وہم کی ایک اور لہر اٹھی۔ ایک میں ہی ہوں یا کوئی دوسرا مجھ میں آن جڑا ہے یا میں دوسرے میں جا جڑا ہوں۔ تو میں اب سارا میں نہیں ہوں۔ تھوڑا میں تھوڑا وہ۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر نہیں، اس نے کہ وہم میں بہہ چلا تھا اپنے آپ کو تھاما، نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو انہونی بات ہے۔ مدن سندری نے کہا اور تو نے مان لیا۔ خیر مدن سندری کی

بات تو یہ ہے کہ اس بے چاری نے اپنے دو پیاروں کے سر اور دھڑ الگ الگ پڑے دیکھے۔ اس سے اس کا دماغ چل بچل ہو گیا ہے پر سورکھ تجھے کیا ہوا کہ انہونی کو ہونی سمجھ بیٹھا۔ یوں دل ہی دل میں اپنے آپ کو روک ٹوک کر ایک دفعہ تو وہ سنبھل گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اسے خیال آیا کہ انہونی بات تو یہ بھی ہے کہ آدمی کا سر اور دھڑ الگ الگ ہو جائیں پھر کوئی دوسرا انہیں جوڑ دے اور آدمی پھر اٹھ کھڑا ہو۔ ہاں یہ تو بالکل انہونی بات ہے۔ جی اٹھنے کے بعد اب پہلی مرتبہ اسے اس انہونی کا خیال آیا۔ اب تک تو اس نے اس بات پہ دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ایسے اٹھ کھڑا ہوا اور مندر سے ایسی سادگی سے نکل آیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب اسے اس بات کا دھیان آیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اپنے آپ سے بولا کہ میں نے تو اپنے کو ایسا کھانڈا مارا تھا کہ سر بھٹے کی طرح اڑ کر دور جا پڑا تھا۔ گردن سے وہ چپکا کیسے اور مجھ میں سانس دوبارہ آیا کیسے اور پھر میں ایسے اٹھ کھڑا ہوا جیسے آدمی گر پڑے اور کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہو کتنے اچرج کی بات ہے اور وہ اتنا حیران ہوا کہ سکتہ میں آگیا مگر پھر اس نے سوچا کہ مدن سندری نے آخر دیوی سے بنتی کی تھی اور دیوی میں بڑی شکتی ہے۔ انہونی کو ہونی کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے یہ سوچتے سوچتے اس نے سوچا کہ اگر ایک کرتب ہو سکتا ہے تو دوسرا کرتب بھی ہو سکتا ہے اس دوسرے کرتب پر بھی اب اسے حیرانی ہوئی پہلے وہ بات کو ہنسی میں اڑاتا رہا، پھر دبدا میں پڑ گیا۔ پر اب وہ حیران ہو رہا تھا کہ اچھا مجھ میں دوسرے کا دھڑ جڑ گیا۔ پر کیسے؟ اپنے آپ سے بولا کہ میری تو عقل حیران ہے کہ ایسا ہوا کیسے۔ پر مدن سندری کہتی ہے کہ ایسا ہوا اور وہ سنی تھوڑا ہی کہتی ہے، آنکھوں دیکھی، خود اپنے ہاتھ سے کی ہوئی کہتی ہے۔ دونوں کرتب اسی کے ہاتھوں سے ہوئے، ایک کرتب دیوی کی دیا سے، دوسرا اپنی بھول چوک سے۔ اس کے بھید وہی جانے۔ جو ہونی ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے چاہے انہونی ہو۔ کتنی انہونی بات ہے پر اب یہ ہے کہ میرا شریر میرا نہیں ہے بیشک میرا ہے، باقی سب کچھ دوسرے کا۔ کتنے اچرج کی بات ہے۔ حیران حیران اس نے پھر اپنے تن پہ نظر ڈالی، ایک بار، دو بار، بار بار۔ ہر بار اس

http://www.pakurdupoint.com

نے اپنے انگ انگ کو دیکھا اور حیران ہوا کہ اچھا یہ کسی اور کے ہیں جو مجھ میں آن جڑے ہیں۔

دھاول کتنی دیر تک اس انہونی پر حیران رہا۔ پھر حیرانی کم ہوتی چلی گئی دکھ بڑھتا چلا گیا۔ وہ یہ سوچ کر کتنا دکھی ہوا کہ اس کا آپا سارا اس کا نہیں ہے۔ دکھی ہو کر پھر اس نے اپنے آپے پر نظر ڈالی ایک بار، دوبارہ، بار بار۔ اور اب اسے احساس ہوا کہ گردن سے نیچے تو بہت کچھ تھا۔ ایک رنگا رنگ دنیا، ایک پوری کائنات کہ اس کے پاس سے نکل گئی کتنا کچھ تھا کہ کھویا گیا۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور دل میں کہا، میں تو اب تنک ہی سا رہ گیا ہوں، باقی تو کوئی دوسرا ہی ہے میرا لے دے کے ایک مستک، باقی تو یہ سب انگ پرائے ہیں۔ ڈیل ڈول اتنا پر میں کتنا لگتا ہے کہ ہوں ہی نہیں اور جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ پھر دبدا میں پڑ گیا کہ اگر میں نہیں ہوں تو یہ میرے بیچ کون سمایا ہوا ہے۔

رات پڑے جب مدن سندری اس کے پاس آئی اور انگ لگی تو وہ بڑبڑایا "سندری پرے رہ۔ یہ میں نہیں ہوں۔"

مدن سندری کچھ حیران کچھ پریشان کچھ کھسیانی کہ اسے دھاول نے ٹھکرا دیا۔ پھر سنبھلی اور بولی "سوامی، تمہارا اس سے مطلب کیا ہے۔ تم کیسے نہیں ہو۔"

وہ دکھ سے بولا "سندری، سر دھڑ کے جھمیلے کے بعد میں رہ ہی کتنا گیا ہوں، لگتا ہے کہ میں ہوں ہی نہیں۔"

"نہیں سوامی، تم ہو۔"

"بھاگوان میں کہاں ہوں۔ میں تو بس مستک تک ہوں۔ مستک سے نیچے نیچے تو سارا تیرا گوپ؟" مدن سندری نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا اور اتنی سختی سے رکھا کہ اس کا سانس رکنے لگا۔

دیر تک دونوں چپ رہے۔ دونوں ہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ دیر بعد مدن سندری نے زبان کھولی "سوامی تم نے مجھے بتایا اور میں نے جانا کہ ندیوں میں اتم

گنگا ندی ہے، پربتوں میں اتم سمیرو پربت۔ انگوں میں اتم مستک۔ دھڑ کا کیا ہے وہ تو سب ایک سمان ہوتے ہیں۔ مانو مستک سے جانا پہچانا جاتا ہے جس کا سر اس کا دھڑ۔ سو میں نے تمہارا مستک دیکھا اور چوٹی سے ایڑی تک تمہیں ایک جانا اور اپنا سوامی سمجھا۔ پر تم مجھے بات بتا کر خود اس سے پھر رہے ہو۔"

دھاول بہت کھسیانا ہوا۔ اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ دل میں کہا کہ مدن سندری سچ کہتی ہے۔ میں نے ہی تو اسے یہ بات بتائی تھی۔ اسے بتا کر میں خود بھول گیا۔ تو چلو اب اس نے مجھے یاد دلا دیا۔ انگوں میں اتم تو مستک ہی ہے چونکہ یہ مستک میرا ہے، سو مستک تلے جتنا کچھ ہے وہ بھی میرا ہے۔ چوٹی سے ایڑی تک میں ہی میں ہوں۔ کوئی دوسرا میرے بیچ نہیں ہے۔

دھاول اپنے کو زیادہ دن نہیں بہلا سکا۔ زبان سے لاکھ کچھ کہتا، اندر تو چور بیٹھا ہوا تھا۔ بس ایک پھانس سی چبھی رہتی کہ یہ تن کسی اور کا ہے۔ سر اپنا، دھڑ پرایا۔ کسر انمل بے جوڑ بات ہے اور اسے اپنا پورا وجود انمل بے جوڑ دکھائی پڑتا۔ جب رات پڑے مدن سندری اس کے سنگ ارام کرتی تو وہ دبدا میں پڑ جاتا کہ وہ تن کس تن سے مل رہا ہے۔ کتنی بار اس کے جی میں آئی کہ اس پرائے دھڑ کو اپنے آپ سے توڑ کر کاندھے پہ لادے لے جائے اور گوپی کے سر پہ دے مارے کہ لے اپنا دھڑ، میرا دھڑ مجھے دے۔ پر وہ دھڑ تو اس کے ساتھ جڑ چکا تھا۔ اسے الگ کرنے کی ترکیب اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ پر پھر بھی اسے کبھی کبھی یوں لگتا کہ جیسے اس کا سر الگ پڑا ہے وہ دھڑ الگ پڑا ہے اور اسے وہ راجکماری یاد آ جاتی جو ایک دشٹ راکشس کی قید میں تھی۔ روز راکشس صبح ہونے پر سرہانے کی چھڑیاں پائنتی رکھتا پائنتی کی چھڑیاں سرہانے رکھتا پھر راجکماری کی گردن مارتا اور اس کا سر چھینکے پہ رکھ باہر نکل جاتا۔ دن بھر راجکماری کا دھڑ مسہری پہ پڑا رہتا، سر چھینکے پہ رکھا رہتا، اس سے بوند بوند خون ٹپکتا رہتا۔ شام پڑے راکشس چلاتا دہاڑتا آتا، پائنتی کی چھڑیاں سرہانے رکھتا، سرہانے کی چھڑیاں پائنتی رکھتا، چھینکے سے سر اتار کر دھڑ سے جوڑتا اور راجکماری جی اٹھتی۔ راجکماری کتنے دکھ میں تھی کہ روز صبح کو اس کا

http://www.pakfunplace.com

سر دھڑ سے کاٹا جاتا روز شام کو سر دھڑ سے جوڑا جاتا۔ پر وہ سوچتا کہ راجکماری کو ایک سکھ تو تھا کہ سر بھی اپنا تھا اور دھڑ بھی اپنا تھا۔

جوں جوں دن گزرے دھاول کا دکھ بڑھتا گیا۔ مدن سندری نے تو یہ سوچا تھا کہ کچھ دن گذر جائیں تو بات آئی گئی ہو جائے گی اور بھولی بسری کہانی بن جائے گی۔ مگر ہوا یہ کہ جتنے دن گزرتے گئے اتنی ہی دھاول کی دبدا بڑھتی گئی۔ مدن سندری کو دیکھ کے وہ کچھ زیادہ ہی دبدا میں پڑ جاتا۔ مدن سندری کو دیکھتا اور سوچتا کہ مدن سندری پوری پر میں آدھا ہوں۔ آدھے سے بھی کم اور جس دھڑ کے ساتھ میں پورا بنتا ہوں وہ میرا نہیں دوسرے کا ہے اور وہ سوچ میں پڑ جاتا کہ دوسرے کے جوڑ سے پورا بن کر وہ کیا بنتا ہے اور کون بنتا ہے اور مدن سندری اس کی کون بنی پھر اس سوال نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس دھڑ کے ساتھ میں کون ہوں، مدن سندری اور اس کے بیچ جو رشتہ تھا اس میں سر دھڑ کے گھپلے سے کچھ گتھی سی پڑ گئی تھی سر دھڑ کے رشتے میں گتھی پڑی ہوئی تھی کہ یہ ایک دوسری گتھی پڑ گئی۔

کتنے دن بیت گئے اور دھاول سے کوئی گتھی نہ سلجھی۔ آخر کو وہ مدن سندری کو ساتھ لے نگر سے نکل پڑا۔ جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا۔ چلتے چلتے اس جنگل میں پہنچا جہاں دیوانند رشی باس کرتے تھے۔ ان کے چرن چھوئے اور بنتی کی کہ مہاراج تم مہا گیانی ہو۔ سرشٹی کے کتنے بھید تم نے پائے، جیون کی کتنی گتھیاں سلجھائیں ایک گتھی میری بھی سلجھا دو۔"

دیوانند رشی نے دونوں کو غور سے دیکھا۔ پھر بولے "بچہ، کیا گتھی لے کے آیا ہے؟"

"مہا گیانی گتھی یہ ہے کہ میں کون ہوں اور مدن سندری کون ہے"، اور پھر دھاول نے اپنی ساری رام کہانی کہہ سنائی۔

رشی جی نے دھاول کو گھور کے دیکھا۔ بولے "مورکھ کس دبدا میں پڑ گیا۔ سو باتوں کی ایک بات تو نر ہے۔ مدن سندری نار ہے۔ جا اپنا کام کر۔"

جیسے دھاول کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ ایک دم سے اٹھ گیا۔ رشی جی کے چرن

چھوئے اور مدن سندری کا ہاتھ پکڑ واپس ہو لیا۔

آنکھوں سے پردہ اٹھ چکا تھا۔ بیچ جنگل سے گزرتے گزرتے دھاول نے مدن سندری کو ایسے دیکھا جیسے مگوں پہلے پر جاپتی نے اوشا کو دیکھا تھا اور مدن سندری دھاول کی ان لالسا بھری نظروں کو دیکھ کر ایسے بھڑکی جیسے اوشا پر جاپتی کی آنکھوں میں لالسا دیکھ کر بھڑکی تھی کہ بھڑک کر بھاگی پھر پسپا ہوئی۔

---

http://www.pakfunplace.com

پورا گیان

منوہر کس سفر پہ نکلا تھا، کس سفر پہ نکل گیا۔ برہمن بچہ تھا پر پڑھنے سے جی اچاٹ تھا، ماس رنگ میں دل پڑا رہتا تھا۔ یہ دیکھ ایک دن باپ نے اسے پاس بٹھایا اور سمجھایا کہ بیٹے ہم برہمن لوگ ہیں۔ ودّیا ہمارا دھن ہے۔ گیان ہمارا گہنا ہے۔ اگیانی ہونا برہمنوں کو نہیں سجتا۔ بیٹے کو باپ کی بات برچھی بن کر لگی۔ ماس رنگ کو تیاگا۔ پستکوں پہ جھک گیا۔ وید، پرانیں، رامائن، مہابھارت کیا کچھ نہیں پڑھا۔ تھوڑے سے سمے میں سب کچھ پڑھ کر ودھوان بن گیا۔ پھر باپ کے سامنے گیا، چرن چھوئے اور چپ کھڑا ہو گیا۔

باپ نے پوچھا "بیٹا کیا کچھ پڑھا؟"

"جتنا لکھا گیا اتنا کچھ پڑھ لیا۔"

"اور جو نہیں لکھا گیا؟"

اس سوال پہ منوہر چکرا گیا۔ باپ مسکرایا اور بولا "بیٹے جتنا لکھا گیا ہے اس سے زیادہ پستکوں میں بند ہے ——— اور اسے بیٹے، پستکوں سے ودّیا ملتی ہے پر گیان گرو بنا نہیں ملتا۔"

منوہر نے یہ سنا اور ترنت نکل کھڑا ہوا۔ نگر نگر گھوما، کتنے پنڈتوں ودھوانوں کے چرن چھوئے، اپدیش سنے، پر روشنی نہ ملی۔ آگے بڑھ گیا۔ آخر کو نگر چھوڑا، بن کی راہ لی۔ کتنے سنتوں سادھوؤں کے چرنوں میں بیٹھا، سیوا کی پر جلدی ہی اکھڑ گیا۔ آگے بڑھ گیا اور آگے اور آگے گھنے بنوں میں بڑھتا چلا گیا۔ کبھی دھوپ کبھی مینہ کبھی آندھی کبھی جاڑا پالا۔ پر اس کے پیر آگے اُٹھتے ہی گئے۔ پاؤں رستے کے کانٹوں سے خون خون ہو گئے۔ بھوک پیاس نے ستایا۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جم گئیں۔ پر اسے کسی بات کا دھیان نہیں تھا۔ آتما جو بیکل تھی۔

چلتے چلتے رستے میں ایک گھنے پیپل کی چھاؤں میں ایک کنواں دکھائی دیا۔ ایک موہنی مورت والی پنہارن نے کنوئیں میں ڈول ڈال رکھا تھا۔ پیپل کی چھاؤں، چھاؤں میں کنواں، کنوئیں سے ڈول کھینچتی سندری، یہ کچھ دیکھ اسے اپنی پیاس کا دھیان آیا، پیاس کا اور تھکن کا۔ بس وہیں من پہ بیٹھ گیا۔ سندر پنہارن نے اسے دیکھا اور پوچھا "اجنبی تو کون ہے۔ یاں پہ کیا لینے آیا ہے"

"ناری! پردیسی ہوں اور پیاسا ہوں"

"پھر پانی پی"، اور یہ کہہ کے اس نے منوہر کی اوک میں ٹھنڈا میٹھا پانی انڈیل دیا۔ اوک میں پانی انڈیلا کو انڈیلتی ہی چلی گئی کہ اس کی نظریں تو پردیسی کے چہرے پہ جم گئی تھیں۔

"بس کر ناری"

اور تب اس ناری کو دھیان آیا کہ ادھر وہ تو سیراب ہو بھی چکا اور وہ پانی انڈیلے چلی جا رہی ہے۔ اس نے ہاتھ روکا اور ڈول ایک طرف رکھا۔

منوہر نے پانی پیا، ہاتھ منہ دھویا۔ تھوڑی جان میں جان آئی۔ ترنت ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جا رہا ہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا جا۔" اس کی آواز مری مری سی تھی۔

اسے جاتے ہوئے وہ تب تک دیکھا کی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ پر منوہر نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ تو اپنی دھن میں تھا۔ آتما کی بیکلی اسے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ بس اسی طرح چلتے چلتے ایک گھنے بن میں جا نکلا۔ دیکھا کہ ایک گھنے برگد تلے ایک بوڑھا سمادھی لگائے بیٹھا ہے۔ کایا بھسم رچی، پسلیاں ایک ایک کر کے گن لو، داڑھی مونچھ کے الجھے الجھے بالوں کے بیچ ہونٹ پچکے ہوئے، آنکھیں موندی ہوئیں، سر کے بال لمبی جٹائیں، سفید سن جیسی۔ اس نے سوچا کہ یہ تو کوئی بڑا رشی ہے۔ دل نے کہا کہ اسی کے چرنوں میں بیٹھ جاؤ۔ جٹاؤں کے بیچ چڑیا نے کر وہاں گھونسلہ بنائے بیٹھی تھی اجنبی کو دیکھ چوں چوں کی، پھریری لی اور پھر سے اُڑ گئی۔ یہ سوتا

http://www.pakfunplace.com

سندر بنی تھے۔ آنکھیں کھولیں۔ اسے گھور کے دیکھا، پوچھا "بالک، کیسے آنا ہوا"

"پربھو، لینے آیا ہوں"

"کیا لینے؟"

"گیان کی مایا"

"مورکھ، گیان کی مایا من کی شانتی سے ملتی ہے۔"

"پھر من کی شانتی ملے"

"من کی شانتی؟ وہ باہر سے نہیں ملتی، اندر سے پھوٹتی ہے۔ جا تپ کر" اور یہ کہتے کہتے سمپورنانند جی نے دور کھڑے گھنے پیپل کی طرف اشارہ کیا۔

منوہر کہ دھوپ میں چل چل کر مرجھا گیا تھا ایک دم سے کھل اٹھا۔ دل نے کہا گورو مل گیا، اب گیان بھی ملے گا۔ تہاتے ہوئے پیپل کی طرف گیا اور اس کی چھاؤں میں پراسن مار کر بیٹھ گیا۔ دم سادھ لیا، آنکھیں موند لیں اور دنیا کے خیالوں وچاروں کو دل اور دماغ سے جھٹک کر ایسے الگ کیا جیسے دامن جھٹک کر گرد جھاڑتے ہیں۔ پر جب اس نے آنکھیں موند لیں اور دنیا کے خیالوں وچاروں کو دل اور دماغ سے نکال چکا تو دھیان میں ایک مورت ابھری۔ یہ اسی پنہارن کی موہنی مورت تھی جس نے اسے پانی پلایا تھا۔ بس وہ تو بیکل ہو گیا، کتنا اس نے اپنے دھیان کو باندھا، مگر وہ مورت کسی نہ کسی رستے اس کے دھیان میں آ جاتی اور اندر سماتی چلی جاتی۔ برس بیتا، دوسرا بیتے، برس بیتتے چلے گئے۔ دل اسی طرح اداس، آتما کی وہی بیکلی۔ ہار کر اپنی جگہ سے اٹھا اور سمپورنانند جی کے چرنوں میں جا بیٹھا۔

سمپورنانند جی نے دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ دیکھا۔ پوچھا "بچے کیا حال ہے۔"

ہاتھ جوڑ کر کہا "گورو من بیاکل ہے۔ آتما دکھ میں ہے۔"

"کارن؟"

"واسنائیں۔"

"واسناؤں کو مار"

"نہیں مرتیں۔ ستاتی ہیں۔"

"کیسے ستاتی ہیں۔"

"ایسے کہ جب میں آنکھیں موند کر پرماتما سے لو لگاتا ہوں تو ناری دھیان میں آ جاتی ہے۔ اور ستاتی اور بلاتی ہے۔"

"یاد رکھ اس اور گیا تو خراب ہو گا۔"

"کیسے خراب ہوں گا۔"

"جیسے راجہ ہرچرن ناری کی اور گیا اور خراب ہوا۔"

"گورو، راجہ ہرچرن کیسے ناری کی اور گیا اور کیسے خراب ہوا۔"

"مورکھ تجھے اس کا پتہ نہیں؟"

"نہیں۔"

"اچھا تو لے سن کہ راجہ ہرچرن کیسے ناری کی چھایا میں گیا اور کیسے اس چھایا نے اسے جل دیا۔" اور سمپورنانند جی نے منوہر کو راجہ ہرچرن کے ناری کی اور جانے اور خراب ہونے کی کہانی سناتی۔

تھوڑی چھایا لمبی دھوپ

ایک تھا راجہ ہرچرن۔ اس کے دیس میں ہر طرح سے سکھ چین تھا۔ دھن برستا تھا۔ دولت کی گنگا بہتی تھی۔ نر ناری سب خوش تھے۔ پرجا اپنے راجہ کو چاہتی تھی۔ راجہ اپنی رانی کو چاہتا تھا۔ بس اسی کے سنگ مگن تھا۔ پرائی ناری کو کبھی بری نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ راجہ شکار کے لئے نکلا۔ جنگل میں گھومتا پھرتا تھا کہ ایک ہرن دکھائی دیا۔ ہرن کیا چھل بل والا تھا کہ راجہ اسے دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ تیر کمان میں جوڑ کر چلا

http://www.pakfunplace.com

اس کے پیچھے۔ مگر وہ ہرن تو چھلاوا بن گیا۔ راجہ اس کی ٹوہ لیتا ہوا دور تک گیا۔

بہت دور جا کر درختوں کے پرے ایک پرچھائیں سی نظر آئی۔ راجہ نے جانا کہ ہرن ہے پھرتی سے آگے بڑھا لیکن درختوں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ہرن تو کوئی نہیں، ہاں ایک ناری چھیل چھبیلی ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھی ہے۔ راجہ اسے دیکھ کر موہت ہو گیا۔ جہاں تھا وہیں جم گیا جانو کہ بت بن گیا۔ ناری نے اسے اس حال میں دیکھا اور پوچھا، "مردوئے تیری کیا نیت ہے۔"

بولا "سندری، میں بلی یاترا سے آ رہا ہوں، دھوپ میں کتنا چلا ہوں اور جلا ہوں۔"

"پھر چاہتا کیا ہے۔"

"چھایا۔"

ہنسی اور بولی "پھر آ جا چھایا میں۔"

یہ سن راجہ پھرتی سے گھوڑے سے اترا اور اس کنج میں اس کے پاس جا کے پسر گیا اور وہ بھی اس پہ ایسے چھا گئی جیسے آسمان پہ گھٹا چھا جاتی ہے۔ وہ تو سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ کب دن ڈھلا کب رات پڑی۔ ہاں جب دن چڑھا تب اسے ہوش آیا۔ ہڑبڑا کر اٹھا آنکھیں مل کر ادھر دیکھا ادھر دیکھا۔ ناری کو کہیں نہ پایا۔ ڈھونڈتا ہوا دور تک گیا، کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف۔ اس کا پتہ کہیں نہ پایا۔ بس بیکل ہو گیا۔ بیکل سی بیکلی۔ راج پاٹ گھر بار سب بھولا۔ دن کا آرام گیا۔ رات کی نیند گئی۔ اس بن میں بھٹکتا پھرتا تھا اور پکارتا تھا۔ "اے میری ٹھنڈی چھایا، میں دھوپ میں ہوں۔"

منوہر نے یہ کہانی سنی چپ رہا جیسے کسی ادھیڑ بن میں ہو۔ پھر بولا "گورو، میں کچھ نہیں سمجھا۔ من اور بیاکل ہو گیا۔"

سمپورنانند جی بولے "بالک اگر تو نہیں سمجھا تو پھر سمجھاتا ہوں۔ تو نے کیا اس ودیارتھی کی کہانی سنی ہے جس نے وہی کیا جس سے ودھوان نے اسے منع کیا تھا۔"

"گورو جی، ودھوان نے کس بات سے منع کیا تھا اور ودیارتھی نے کیا کیا۔"

سمپورنانند جی نے کہا کہ "اگر تو نے یہ کہانی نہیں سنی ہے تو پھر سن۔" اور انھوں نے ودیارتھی اور ودھوان کی کہانی سنائی۔

ودھوان اور ودیارتھی

ایک ودیارتھی ایک مہا ودھوان کے پاس پہنچا اور کہا کہ "ودھوان جی، مجھے سکشا دو۔"

ودھوان نے کہا کہ "لڑکے میں تجھے سکشا دوں گا۔ مگر ایک بات پہلے ہی باندھ رکھ کہ تجھے ناری سے بات نہیں کرنی ہے۔"

ودیارتھی نے اچنبھا کیا اور پوچھا کہ "ناری سے بات کروں گا تو کیا ہو جائے گا۔"

ودھوان نے کہا "ناری تجھ سے بات کرے گی تو مسکرائے گی۔"

"ناری مسکرائے گی تو پھر کیا ہو جائے گا۔"

"پھر تو بھی مسکرائے گا۔"

"میں مسکراؤں گا تو پھر کیا ہو گا۔"

"پھر ناری تجھے مدھ بھرے نینوں سے دیکھے گی اور تجھے لالسا آئے گی۔"

"ناری مجھے مدھ بھرے نینوں سے دیکھے گی اور مجھے لالسا آئے گی تو پھر کیا ہو گا۔"

"پھر تو ناری کے پیچھے دوڑے گا۔"

"ودھوان جی، میں ناری کے پیچھے کیسے دوڑوں گا۔"

"جیسے پرجاپتی اوشا کے پیچھے دوڑے تھے۔"

"پرجاپتی اوشا کے پیچھے کیسے دوڑے تھے۔"

"پرجاپتی اوشا کے پیچھے ایسے دوڑے تھے کہ وہ ان کی لالسا بھری نظروں کو دیکھ کر ہرنی بن گئی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ پرجاپتی ہرن بن کر اس کے پیچھے دوڑے اور ... سے

http://www.pakfunplace.com

ملے۔ پھر وہ مورنی بن گئی اور اڑ گئی۔ پر جاپتی مور بنے اور اس کے پیچھے پیچھے اڑے۔ آخر کو اسے جالیا اور اس سے ملے۔ پھر وہ گائے بن گئی اور بھڑک کر بھاگی۔ پرجاپتی سانڈ بن کر اس کے پیچھے بھاگے۔ اسے جا دبوچا اور اس سے ملے۔ اوشا نے سو بھیس بدلے اور سو روپ لئے پر پرجاپتی نے بھی اتنے ہی بھیس بدلے، اتنے ہی روپ لئے اور اتنی ہی بار اس سے ملے۔"

ودیارتھی یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا سارے دن اسی سوچ میں رہا۔ بدھی میں کچھ نہ آیا کہ دودھوان نے جو بات کہی وہ ہوئی کیسے۔

اب سنو کہ جس گلی میں وہ رہتا تھا۔ اسی گلی میں ایک کنیا اس کے برابر والے گھر میں رہتی تھی کہ نام اس کا سرسوتی تھا۔ سرسوتی پر اس نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ آج جو اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہا۔ دل میں سوچا کہ اس سے بات کر کے تو دیکھوں۔ جب سرسوتی سے بات کی تو سرسوتی مسکرا پڑی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر سرسوتی لجائی اور اسے مدھ بھرے نینوں سے دیکھا۔ سرسوتی کی یہ ادا دیکھ کر اس کا جی اس پہ للچانے لگا۔ اس کی للچائی نظروں کو دیکھ کر سرسوتی ایسے بھڑکی جیسے جنگل کی ہرنی پتے کے کھڑکنے پہ بھڑکتی ہے بس وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کے بھڑکنے اور بھاگنے سے ودیارتھی کی لالسا بھڑک اٹھی لپک کر اس کے پیچھے چلا۔

دوسرے دن دودھوان نے ودیارتھی کا بہت رستہ دیکھا۔ پر وہ نہ آیا۔ وہ تو سرسوتی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ سرسوتی نے کیا کیا روپ بدلے۔ مگر وہ بھی کم نہیں تھا جتنے اس نے روپ بدلے اتنے ہی اس نے سوانگ بھرے۔ وہ ہرنی تو یہ ہرن۔ وہ مورنی تو یہ مور۔

جب بھیوما نند جی کہانی سنا چکے تو منوہر پھر چکر میں پڑ گیا۔ چپ رہا، پھر بولا "گورو جی، میں کچھ نہیں سمجھا من اپنا اور بیاکل ہو گیا۔"

گورو جی پیار سے بولے "اچھا بالک پھر سمجھاتا ہوں۔ تو نے وشوامتر جی کی تپسیا میں

بھنگ پڑنے کی کہانی تو سنی ہو گی۔"

منوہر بولا "گورو وہ کیا کہانی ہے؟"

"اچھا وہ کہانی تو نے نہیں سنی۔ ہے تو نے سن" اور گورو نے چیلے کو وشوامتر جی کی تپسیا میں بھنگ پڑنے کی کہانی سنائی۔

تپ میں بھنگ

ایک بار وشوامتر جی نے ایسی تپ کی کہ دیوتاؤں میں کھلبلی پڑ گئی۔ انہیں ڈر پڑ گیا کہ وشوامتر اسی طرح تپ کرتا رہا تو وہ دیوتا بن جائے گا اور پھر وہ ان کی برابری کرے گا۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھے اور سوچنے لگے کہ وشوامتر کو دیوتا بننے سے کیسے روکا جائے۔ ایک نے بہت سوچ کر کہا کہ "وشوامتر کی تپ کا کاٹ ناری ہے۔"

"ناری؟ . . . . وہ کیسے۔"

"متر و، منش جاتی کی ایک ہی تو کمزوری ہے۔ ناری۔ کیسا کیسا لوہا لاٹھ آدمی ناری کے سامنے موم ہو جاتا ہے۔"

دیوتاؤں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ انہوں نے مینکا اپسرا کو پھسلایا۔ سمجھایا کہ تو دھرتی پہ جا کے وشوامتر کو رجھا اور اس کی تپسیا میں کسی طرح بھنگ ڈال۔

مینکا دیوتاؤں کے بہلاوے میں آ گئی۔ دیوستھان سے اتر کر اس بن میں پہنچی جہاں وشوامتر جی تپ کر رہے تھے مینکا اٹھلاتی ہوئی ان کے سامنے آئی اور اپنا جوبن ایسا دکھایا کہ وشوامتر جی کا دل بیکل ہو گیا۔ سوتی ہوئی کامنا جاگی۔ بر بچھیریا لن بھولے، تپ سے جی اچاٹ ہوا۔ سمادھی سے اٹھے، مینکا کے پاس جا کے بیٹھے کہ اے بھاری کولہوں گامدم رانوں والی ناری، تو مجھ سے مل۔ وہ اٹھلا کر بولی "ورشی جی، کیسی بات کرتے ہو۔ نہ کوئی اوٹ نہ کوئی پردہ۔ اوپر دیوستھان والے نیچے دھرتی والے سب ہمیں دیکھیں گے۔"

http://www.pakfunplace.com

"سندری، اس کی چنتا مت کر۔ ابھی اوٹ ہوئی جاتی ہے۔" یہ کہتے کہتے وشوامتر جی نے بادلوں کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ بادل ترنت دیوستھان اور دھرتی کے بیچ چھا گئے انہوں نے پھر بادلوں کو اشارہ کیا۔ اب بادل اردگرد منڈلانے لگے۔ وشوامتر جی بادلوں کے بیچ مینکا سے ملے۔

مل تو لیے، پر اس کے بعد کیا ہوا۔ وشوامتر جی کی ساری تپ پہ پانی پھر گیا۔ محنت اکارت گئی۔ ان میں جو دیوتاؤں والی شکتی پیدا ہو چلی تھی وہ جاتی رہی۔

سمپورمانند جی یہ کہانی سنا کر چپ ہو رہے سمجھے کہ اب بالک کی سمجھ میں بات آگئی ہوگی۔ پر منوہر سوچ میں پڑ گیا۔ چپ رہا۔ پھر بولا "گوروجی، میں کچھ نہیں سمجھا۔ من اور بیاکل ہو گیا۔"

گورو نے غصے سے چیلے کو دیکھا۔ بولے "مورکھ میں نے تجھے اتنا سمجھایا، تو نہ سمجھا کہ کام واسنا نے تیری مت ماردی ہے نہیں سمجھتا تو میرا پیچھا چھوڑ اور جا ناری کے پاس۔ اب وہی تجھے سمجھے گی اور سمجھائے گی۔"

منوہر نے اس بات کو گورو کی آگیا جانا۔ وہاں سے اٹھ بن سے ایسے نکلا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ دنوں کا فاصلہ گھنٹوں میں، گھنٹوں کا فاصلہ پلوں میں طے کیا۔ پھر اسی کنوئیں پہ پہنچا۔ کنوئیں کی من پہ پانی سے ڈول بھرے وہ سندری ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی کا رستہ دیکھ رہی ہو۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ بولی "تو آگیا؟"

"ہاں سندری، میں آگیا۔"

"کیسے آگیا۔"

"بس پیاس لگی۔ میں آگیا۔"

وہ پیچ پچ آگیا۔ بس اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ترسی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور التجا بھرے لہجے میں بولا "اے میری میٹھی ندی، میں پیاسا ہوں۔"

وہ ناری پیچ پچ ندی کی طرح امنڈی۔ منوہر جیسے گنگا نہا لیا ہو۔ دن ڈوبا، رات آئی۔ پھر دن چڑھا، پھر رات آئی۔ جانے کتنے دن آئے اور بیت گئے۔ کتنی راتیں پڑیں کبھی اندھیری کبھی چاندنی۔ کتنی صبحیں چڑھیں کبھی گرم کبھی ٹھنڈی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کتنے دن گزر گئے کتنا سمے بیت گیا۔ بس ایک دن اچانک چونکا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔ باپ کا خیال آیا۔ باپ کی بات یاد آئی۔ دل میں کہا کہ میں کس سفر پہ نکلا تھا اور کس رستے پہ چل پڑا۔ تڑپ کر اس ناری کے پاس سے اٹھا اور چل کھڑا ہوا۔

منوہر پھر اسی جنگل کی طرف چلا جس جنگل سے رستہ تڑا کر وہ یہاں آیا تھا۔ اس جنگل میں سمپورمانند جی اسی طرح بیراسن کیے بیٹھے تھے۔ مگر اب ان کی شانتی میں کھنڈت پڑ چکی تھی۔ اندر ہی اندر الٹے سوال سر ابھار رہے تھے۔ وشوامتر جی نے کیوں ایسا کیا۔ اچھے بھلے دیوتا بن چلے تھے۔ ایسی شکتی پالی تھی کہ دیوتاؤں کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ تنک سے ناری سواد کے پیچھے دیوتائی کھو بیٹھے۔ سمپورمانند جی اندر ہی اندر بہت کڑھے۔ پھر بڑبڑائے کہ دیورشی نے یہ اچھا نہیں کیا۔ مگر اتنا کہہ کر وہ خود شک میں پڑ گئے۔ کیا دیورشی اس بات کی اونچ نیچ کو نہیں سمجھتے تھے۔ ضرور سمجھتے ہوں گے۔ تو پھر؟ اور اچانک سمپورمانند جی کو پراسر رشی کا دھیان آیا جنہوں نے جمنا جی کے بیچ ستیاوتی کو ناؤ چلاتے دیکھا اور اس پہ ریجھ گئے "اے مچھلی ایسی تڑپتی رانوں والی ناری مجھ سے مل۔" اور بے چاری ستیاوتی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ناؤ کھینا بھول۔ اس کی اپنی ناؤ ڈولنے لگی تھی چکر میں پڑ گئی۔ دونوں طرف سے مشکل تھی۔ ملنے تو کیسے ملنے۔ نہ ملنے تو رشی کا اپمان ہوتا ہے۔ اس نے شراپ دے دیا تو؟ بڑی مشکل سے بات بنائی کہ دیورشی، میں تمہاری داسی۔ پر جمنا کے دونوں کناروں پہ کتنے جوگی کتنے رشی کھڑے ہیں۔ وہ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے پراسر جی نے یہ سن ترنت اپنے اور ستیاوتی کے اردگرد دھند پیدا کی اور ستیاوتی پہ چھا گئے۔

سمپورمانند جی سوچ میں پڑ گئے۔ کیسا کیسا رشی ناری کو دیکھ کے ڈول گیا۔ دنیا کو کس

http://www.pakfunplace.com

فرج تیاگا کر بستی کو چھوڑ کر جن بنوں میں باس کیا، من کو مارا، موہ مایا سے چھٹکارا پایا پہ ناری کی ایک چھب نے سارے کو ملیامیٹ کر دیا۔ مگر کیوں ایسا ہوتا ہے۔ سمپورنا نند جی نے اس گتھی کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر جتنا سمجھانے کی کوشش کی اتنا ہی الجھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ان کی آتما اشانت ان کا من بیکل ہوتا چلا گیا۔ کب سے وہ یہاں اس بوڑھے برگد تلے شانتی کا برگد ودیا کا پربت بنے بیٹھے تھے۔ راجے مہاراجے جوگی بیراگی، دھرمی ادھرمی، گیانی اگیانی یہاں آتے۔ من کی شانتی، آتما کا سکھ، ودیا کے ہیرے موتی لے کر جاتے۔ پر اب وہ برگد اپنی جگہ سے ہلا ہوا تھا۔

" گورو، میں آگیا ہوں" منوہر اچانک آن دھمکا۔

سمپورنا نند جی نے چیلے کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ کتنا اچنبھا ہو رہا تھا انہیں۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو اس کی آتما کتنے دکھ میں تھی اور اس کے من میں کتنی بیکلی تھی۔ اب اس کا طور ہی بدلا ہوا تھا۔ اپنے آپ میں مگن بیکلی کی جگہ آنند۔ چرنوں میں آکر ایسے بیٹھا جیسے اب سکشا کے لئے اس کے دل کے دماغ کے سب دروازے کھلے ہوں۔

سمپورنا نند جی کو پہلے اچنبھا ہوا۔ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ایکا ایکی اپنے استھان سے جہاں وہ جانے کس جگہ سے پربت سمان جمے بیٹھے تھے۔ ایک بیکلی کے ساتھ اٹھے۔

منوہر سے بولے "ششش، تو اس استھان پہ بیٹھ، میں چلتا ہوں۔"

منوہر گورو کا منہ تکنے لگا۔ چکرا کر بولا "گورو جی، میں تمہارے چرنوں میں آیا اور تم جا رہے ہو۔ پر کس یاترا پہ جا رہے ہو۔"

"گیان یاترا پہ"

"گیان یاترا پہ؟" منوہر اور چکرایا "آپ سے گنی گیانی، گیان کی اب کون سی یاترا تمہارے لئے رہ گئی ہے"

بولے "ششش، پورا گیان کسے ملا ہے سو مانو کو چاہیئے کہ چلتا رہے۔"

اور سمپورنا نند جی منوہر کو اپنے استھان پہ بٹھا اس بن سے نکلے اور جمنا ندی کی طرف چل پڑے۔

سمپورنا نند جی جمنا ندی کے کنارے کنارے چلے جاتے تھے۔ اس کنارے اور اس کنارے کتنے رشی سمادھی لگائے نظر آئے۔ پر سمپورنا نند جی کی نظریں تو ان ناؤں کو ٹٹول رہی تھیں جو جمنا کے بیچ ڈول رہی تھیں۔

---

http://www.pakfunplace.com

دھوپ

اس مرتبہ وہ اچانک آنکلی۔ بالکل خلاف توقع۔ وہ امید ہی چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس نے اسے منانے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن وہ کسی صورت نہ منی۔ سخت ناراض تھی۔ ناراض ہونے کی بات بھی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پورا منظر اس کے تصور میں اُبھر آیا۔ کتنی منت سماجت کے بعد تو اس نے ملاقات کی حامی بھری تھی اور اس کے یہاں کتنا اشتیاق تھا۔ جب وقت طے ہوگیا تو اس کے لئے وقت گزارنا مشکل ہوگیا کس اضطراب سے اس نے رات سے صبح کی۔ صبح سے دوپہر پھر کتنا بن ٹھن کر کس شوق کے ساتھ وہ جناح گارڈن پہنچا جہاں کے ایک سبز گوشے میں یہ ملاقات ٹھہری تھی۔ وہ اس عجلت کے ساتھ گھر سے چلا جیسے اسے دیر ہوگئی ہے۔ جیسے اس نے رفتار ذرا سست کی تو ادھر وہ آئے گی اور اسے نہ پاکر واپس چلی جائے گی۔ اس عجلت میں وہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ مگر اس نے ایک گھنٹہ پہلے ہی سے اس شدت سے انتظار کرنا شروع کیا جیسے وہ اسی گھڑی پہنچنے والی ہے۔ جب کوئی رکشہ گیٹ میں داخل ہوتی تو وہ سمجھتا کہ وہ آرہی ہے۔ بیٹھے سے کھڑا ہو جاتا اور دیکھنے کی کوشش کرتا کہ رکشہ کے اندر کون بیٹھا ہے۔ جب رکشہ گارڈن میں اپنی حد پہ آکر رکتی تو اس میں سے کوئی اجنبی جوڑا اترتا تو وہ تھوڑا افسردہ ہوتا اور پھر اس بنچ پہ جا بیٹھتا جہاں سے وہ گیٹ میں داخل ہونے والوں کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں کتنے جوان جوڑے اس باغ میں آئے اور سبز گوشوں میں گم ہوگئے۔ کوئی رکشہ میں سوار آیا، کوئی سکوٹر پہ آگے پیچھے بیٹھ کر آیا۔ یوں بھی ہوا کہ کوئی لڑکی اکیلی رکشہ سے اتری اور کسی نوجوان نے لپک کر اس کا استقبال کیا۔ جوان جوڑے آتے ہی چلے جا رہے تھے۔ جیسے ساری ملاقاتیں آج ہی انہی اوقات میں

اسی باغ میں ہونی ہیں۔ دن بھی تو سہانا تھا۔ ستمبر کا دن اگر ابر آلود نہ ہو تو کتنا خوب ہوتا ہے اور پھر اس باغ میں جہاں جا بجا وسیع و عریض سبزہ زار تھے، سبزے سے اور دھوپ سے بھرے ہوئے کتنی دیر وہ سبزے اور دھوپ سے بھرے ہوتے اپنے گوشے میں پتھر کی بنچ پر سراپا انتظار بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ بے چین ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، بڑبڑایا، "اب تک تو اسے آجانا چاہیئے تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہوئی،" پھر خود ہی دل کو سمجھایا "کوئی ایسی دیر تو نہیں ہوئی۔ تھوڑا وقت تو رکشہ ڈھونڈنے میں بھی لگ جاتا ہے بس آرہی ہوگی" اور پھر اس نے بڑی بے کلی کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیا۔ ایک رکشہ کی آواز نے پھر اسے چونکایا۔ دل ہی دل میں طے کیا کہ یہ رکشہ ضرور اسی کی ہے۔ تیزی سے گیٹ کی طرف چلا۔ مگر رکشہ اپنی حد پہ آکر رک گئی تھی اور جو لڑکی اس میں سے اتری تھی اسے خوش آمدید کہنے کے لئے ایک نوجوان وہاں پہلے سے منتظر رہا تھا۔ واپس اپنے گوشے میں آیا اور پھر ٹہلنے لگا۔ بڑبڑایا "پتہ نہیں کہاں رہ گئی۔۔۔۔ کمال کر دیا اس لڑکی نے" رکا، پھر بڑبڑایا "پہلے بھی اس نے یہی کیا تھا۔۔۔ بعد میں فون کرکے معذرت کرے گی کہ رکشہ نہیں ملی۔۔۔ بکواس" برہمی سے بڑبڑایا اور چپ ہوگیا۔ اس برہمی نے اس پہ یہ اثر کیا کہ ٹہلتے ٹہلتے رکا۔ بنچ پہ بیٹھا جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ سگریٹ سلگائی اور دھواں اڑانے لگا۔ بنچ کی پشت سے ٹیک لگائی اور گیٹ سے نظریں ہٹا کر دور درختوں میں دیکھنے لگا۔ یہ منظر کتنا بھلا لگ رہا تھا یہاں۔ سے وہاں تک دھوپ ہی دھوپ۔ دھوپ اور درختوں نے مل کر اس پہ اثر کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ ٹیکسی کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ ایک ٹیکسی قریب ہی آکر رکی تھی۔ سمجھا کہ وہ آگئی۔ اُٹھنے لگا تھا کہ اس میں سے کوئی اجنبی جوڑا اترا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک روش پہ ہو لیا۔ اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

اب اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہی تھی۔ ایک مرتبہ آنکھیں بالکل ہی بند ہونے لگی

http://www.pakfunplace.com

تھیں کہ اس نے کوشش کر کے اپنے آپ کو سنبھالا۔ "لو مجھے تو نیند آنے لگی۔ میں سو جاؤں اور وہ آ جائے۔ دیکھ کے کیا سوچے گی۔۔۔۔ لو جیسے وہ آ ہی رہی ہے۔" چپ ہوا، پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔ "ملاقات بھی تو تقدیر سے ہوتی ہے۔" ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے چپ ہوا پھر دور درختوں میں دیکھنے لگا۔ دھوپ میں اشنان کرتے ہوئے درخت۔ جیسے ان درختوں سے نیند اتر رہی ہو۔ اس کے پپوٹے بھاری ہوتے گئے۔ آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ ابھی ابھی ایک ٹیکسی اپنی حد پر آ کر رکی تھی اور اس کے اندر سے اترنے والے بچوں نے اسی گوشے کی طرف اتنی تیزی سے دوڑ لگائی تھی اور اتنا شور مچایا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور حیران ہوا۔ "اچھا میں اتنی دیر سویا تھا"، اور گھبرا کر جب اس نے گیٹ کی طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ وہ جا رہی ہے وہ۔ بجلی کی تیزی سے کھڑا ہوا۔ مگر اتنی دیر میں واپس ہوتی ہوئی ٹیکسی اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ٹیکسی کو اس نے اشارے سے روکا۔ بیٹھی۔ اور ٹیکسی فوراً ہی گیٹ سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی اور جیسے اس کی ٹانگوں سے کسی نے دم کھینچ لیا ہو۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں۔"

"جی۔ کچھ نہیں۔" وہ سٹپٹا گیا۔

"میرے آنے پر کسی سوچ میں پڑ گئے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔" مگر دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔ یہ وقتِ ملاقات ہے اور تم پچھلے خیالوں میں کھو گئے۔ اس نے اگلے پچھلے خیالوں کو رفع دفع کیا اور باتیں کرنے کے لئے تیار ہو بیٹھا مگر پھر دیر ہو گئی اور اسے کوئی بات ہی نہیں سوجھی۔

"ویسے میں سمجھ رہی تھی کہ میں پہنچوں گی تو آپ سو رہے ہوں گے۔"

"آج میں نہیں سو سکتا تھا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آج مجھے کسی کا انتظار نہیں تھا۔"

وہ مسکرائی۔ شہ پا کر وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر بولا۔ "دھوپ کا بھی تو اپنا جادو ہوتا ہے آپ کو دھوپ کیسی لگتی ہے۔"

"دھوپ کیسی لگتی ہے؟" وہ تھوڑا چکرا گئی۔

"جی ہاں! میرا مطلب ہے جاڑے کی دھوپ" اور جواب کا انتظار کئے بغیر جاری ہو گیا۔ "دیکھئے موسم درجہ حرارت کا نام نہیں، کیفیت کا نام ہے۔ ایک موسم باہر ہوتا ہے۔ ایک موسم ہمارے اندر ہوتا ہے اور ہر موسم کا ایک پھل ہوتا ہے۔ معلوم ہے جاڑے کے موسم کا پھل کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

"دھوپ!"

"دھوپ؟"

"جی ہاں دھوپ۔ جاڑوں کا پھل بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ بس جی چاہتا ہے کہ جاڑوں کی دوپہر ہو، دھوپ ہو، چاروں طرف دھوپ ہی دھوپ ہو میں دھوپ میں نہا جاؤں اور سو جاؤں اور پھر کوئی دھوپ پدی آئے اور آہستہ سے اپنی انگوٹھی میری انگلی میں پہن کر چلی جائے اور جب میں جاگوں تو حیرت سے اپنی انگلی دیکھوں اور سوچوں کہ انگوٹھی کس نے پہنائی۔ مگر۔۔۔۔" کہتے کہتے رکا اور اداس ہو گیا۔

وہ ہنس پڑی۔

"کمال ہے آپ ہنس رہی ہیں اور میں اداس ہو گیا ہوں"

"وہ کیوں؟"

"اپنی خالی انگلیاں دیکھ کر۔"

http://www.pakfunplace.com

وہ پھر ہنس پڑی۔ ہنستے ہنستے اس نے اس پر ایک نظر ڈالی "اداس ہو کر آپ سو تو نہیں جائیں گے۔"

"جی؟" اور اسے اچانک لگا جیسے اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں "لیجئے مجھے تو سچ مچ نیند آنے لگی۔"

"مگر یہاں تو دھوپ نہیں ہے" اس نے قہقہہ لگایا۔

"دھوپ؟" وہ غنودگی آمیز آواز میں بڑبڑایا "جاڑے کی دھوپ۔ بس یہی لگ رہا ہے"

اور اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

اس نے حیرت سے اسے دیکھا، دیکھتی رہی۔ پھر قریب میز پر پڑی ہوئی کتاب اٹھائی۔ اس کے صفحے الٹنے پلٹنے لگی۔ جہاں تہاں سے پڑھتی اور صفحہ الٹ دیتی۔ پھر اس نے ایک لمبی جمائی لی اور کتاب کو الگ ڈال دیا۔ اسے دیکھا وہ تو باقاعدہ سو رہا تھا۔ عجیب آدمی ہے۔ وہ بڑبڑائی۔ پھر اس کے پپوٹے بھی بوجھل ہونے لگے۔

---

http://www.pakfunplace.com

برج کی کہانی

اب صبح ہوئے ناشتہ کرتے کرتے اسے اچانک رات کی بات کا خیال آیا۔

"یار کیا کہہ دیا تھا تم نے اس کے بارے میں بہت خفا ہے وہ۔"

"کون؟"

"اچھا اب وہ کون ہو گئی۔ اتنی بیگانگی؟"

"اچھا اچھا نسرین ہوا یہ کہ وہ ......"

"نسرین نہیں" شوکت نے اس کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

"اچھا۔ پھر کون" وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔

شوکت نے آہستہ سے جیسے سرگوشی کر رہا ہو کہا "سعیدہ"

"سعیدہ؟" وہ چکرایا "وہ کہاں سے آ گئی۔ گڑے مردے اکھاڑنے لگے ہو"

"وہ تو تم اکھاڑ رہے ہو۔ یہی تو مجھے تعجب ہوا کہ اب تمہیں اس کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور پھر اس انداز سے وضعداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آخر کسی وقت تو تمہارا اس سے ......"

بس اسی گھڑی سلیم داخل ہوا "یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ برج دیکھنی نہیں ہے"

"بالکل دیکھنی ہے۔ ہم تو بس تمہارا انتظار کر رہے تھے"

"بس پھر اٹھ کھڑے ہو۔"

اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے وہاں بس ان کے پہنچنے کی دیر تھی۔ برج، شروع ہو گئی۔

اس کے بعد کھانا پینا۔ ساتھ ساتھ بحث۔

"میں پوچھتا ہوں۔ مولویوں کو اس فلم پر کیا اعتراض تھا"

"مولوی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ فلموں کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ ہونے لگے تو پھر مولویوں کو کون پوچھے گا۔"

"چھوڑو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ کہ شطرنج کے کھلاڑی کس روز دکھا رہے ہو۔"

"جس روز کہو۔"

"کسی روز بھی پروگرام رکھ لو۔ تمہاری وی سی آر کا اتنا فائدہ تو ہونا چاہیئے کہ دو چار معقول فلمیں ہم دیکھ لیں۔"

ایک بات سے دوسری بات۔ دوسری بات سے تیسری بات۔ اسی میں ڈیڑھ بج گیا۔ گھر پہنچتے ہی کپڑے بدلے اور فوراً ہی سو گیا۔ نیند گہری آئی۔ دن بھر کا تھکا ہوا جو تھا۔

اور اب جب نہا دھو کر ناشتہ کی میز پر آکر بیٹھا تو رات کی بات یاد آئی۔ سبحان اللہ فلم کے کتنے منظر آنکھوں میں پھر گئے۔ بس اسی گھڑی اخبار والا اخبار پھینک گیا اور ادھر اس نے اخبار اٹھایا۔ ادھر ناشتہ چنا گیا۔ مگر اخبار ایک بار ہاتھ میں آجائے تو آسانی سے تو اسے اٹھا کر الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ کتنی دیر ورق الٹتا پلٹتا رہا۔ خبروں پر نظر دوڑاتا رہا۔ آخر کو منی کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ وہ اچک کر میز پر آئی اور اس کی طرف منہ کر کے صدا لگائی۔

"میاؤں"

اخبار الگ رکھتے ہوئے منی کو جھڑکا "نیچے اترو، پھر لے گا۔"

منی فوراً ہی نیچے اتر گئی۔ اس نے چائے کی پیالی کی طشتری میں دودھ دانی سے تھوڑا دودھ انڈیلا اور منی کے سامنے رکھ دیا جسے اس نے فوراً ہی چپڑ چپڑ کر کے پی ڈالا کہ اس کے فوراً بعد اس کی طرف منہ اٹھا کر پھر صدا لگائی "میاؤں"

"بس اب جاؤ" منی کو پیار سے سمجھایا کہ اس روکھے پھیکے ناشتے میں سے جس میں دو توس ایک ابلے انڈے سے زیادہ کچھ نہیں تھا وہ اس سے زیادہ اس کی اور کیا

تواضع کر سکتا تھا۔ بس منی کو پچکارتے پچکارتے اچانک شوکت کی بات یاد آئی۔ مگر وہ تو بات ہی پوری نہیں ہوئی تھی۔ مگر کیا بات۔ سعیدہ؟ یہ بی بی اب کہاں سے آن ٹپکی اور میں نے اس کے بارے میں کیا کہا تھا۔ کب۔ کہاں۔ کس سے۔ اب بھلا مجھے اس کے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شوکت اپنی طرف سے ہانک رہا ہوگا اور اس نے بات کو ذہن سے رفع دفع کر کے ناشتہ شروع کر دیا۔

بات کو اس نے اپنی طرف سے رفع دفع کر دیا تھا اور پورے انہماک سے ناشتہ کر رہا تھا۔ مگر جب اس نے ناشتہ کر کے سگریٹ سلگائی اور چائے کی دوسری پیالی بنائی تو اسے پھر وہی خیال آگیا۔ وہ اس بات کو کوئی اہمیت تو دینا نہیں چاہتا تھا مگر پھر سوچا کہ چلو پوچھ تو لیں کہ آخر بات کیا ہوئی۔ اٹھ کر فوراً فون کے پاس گیا۔ ڈائل گھمایا "ہیلو، شوکت۔ میں حفیظ بول رہا ہوں۔ یار رات کا پروگرام اچھا رہا۔ ..... ہاں ٹھیک ہے۔ اس سالے میلم نے یہ کام اچھا کیا کہ وی سی آر لے لیا۔ ..... ہاں یار اس کا پروگرام بھی بننا چاہیئے اور یار تم رات کیا بات کر رہے تھے ..... یہ سعیدہ کا شوشہ تم نے کس خوشی میں چھوڑا ..... اور شوشہ نہیں تو کیا ہے ..... کیا، نہیں یار ..... اچھا تو وہ آئی ہوئی ہے ..... اچھا ..... ہاں حیرت تو ہے، ہونی چاہیئے ..... اچھا خیر آئی ہو گی، مجھے کیا اور مجھے تو اس کے بعد پھر کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں اس کے متعلق کیا بات کرتا۔ کیوں کرتا" اور یہ کہتے کہتے اس کا ذہن کسی اور لہر میں بہہ گیا۔ عجیب بات ہے، پھر اس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ جیسے وہ ہے ہی نہیں، جیسے تھی ہی نہیں۔ مگر وہ لہر جلد ہی بکھر گئی۔ "کیا کہا" ایک دم سے وہ چونکا اور پھر بھڑک اٹھا "اس نے یہ کہا میرے بارے میں بہت گھٹیا نکلی۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اب تک اس کے خیال میں الجھا ہوا ہوں ..... معذرت ..... اس پر لعنت بھیجتا ہوں اس پر ..... گھٹیا عورت ہے" اور اس نے غصے سے فون بند کر دیا۔

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی پیالے میں انڈیل کر نئی پیالی بنائی۔ پیالی اٹھائی تو ہاتھ

http://kitaabistan.com
pakistanipoint.com

کانپ رہے تھے۔ پارہ اس کا ایک دم سے کتنا چڑھ گیا تھا۔ اسی چڑھے پارے کے ساتھ چائے کے تیز تیز گھونٹ لئے اور آخر میں پیالی حلق میں انڈیلی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر کیوں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب اسے کیا کرنا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ٹانگوں کے آس پاس دم ہلاتی ہوئی منی کو اس نے عصیلی نظروں سے دیکھا جیسے سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ اسے ٹھوکر ماری اور چلتے چلتے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گھڑی کی سوئی سے اس نے اپنی سمت طے کی۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ بس یہی کہ تپلون چڑھایا، بشرٹ پہنی اور زن سے باہر۔

سیدھا شوکت کے دفتر پہنچا۔ شوکت نے کہ ابھی ابھی دفتر پہنچ کر اپنی میز پر بیٹھا تھا۔ اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا "بہت غصے میں نظر آ رہے ہو۔"

"اس کا حساب صاف کرنے آیا ہوں"

"ابھی تک حساب صاف نہیں ہوا تھا؟"

"میں تو مدت ہوئی اس کے ساتھ حساب صاف کر چکا ہوں۔ یہی اسے بتانا چاہتا ہوں"

"دانت کچکچا کر" بہت گھٹیا عورت ہے۔"

شوکت نے اسے غور سے دیکھا "سعیدہ کو کہہ رہے ہو؟"

"ہاں سعیدہ کو"

"اور تم کہہ رہے ہو؟"

"ہاں میں کہہ رہا ہوں اور میری یہ بات تمہیں اس تک پہنچانی ہے"

شوکت نے ستائش سے اسے دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا "حفیظ، تم نے اس سے محبت کی ہے۔"

"کی تھی جب کی تھی۔ اب تو نہیں کرتا۔"

"محبت میں اب اور جب نہیں ہوا کرتا۔"

"ہوا بھی نہیں کرتا اور ہوتا بھی ہے۔"

"میرے لئے تو نہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو تم اتنی ذرا سی بات پر بھڑک کیوں اٹھے۔"

"یہ اتنی ذرا سی بات ہے۔"

"ہاں اس اعتبار سے کہ تمہیں کہنے والوں نے اس سے زیادہ سخت باتیں کہی ہیں اور تم کبھی اس طرح نہیں بپھرے۔ یہی میں نے سعیدہ سے کہا کہ ویسے تو آپ بہت رکھ رکھاؤ والی ہیں۔ کوئی اچھی بری بات کہے تو اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتیں۔ اس ذرا سی بات پر آپ آگ بگولا ہو گئیں۔ کیوں، کیا اس وجہ سے کہ یہ بات حفیظ کی طرف سے آئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ابھی تک اسے فراموش نہیں کر سکی ہیں۔"

"کیا بولی" اس نے غصے سے پوچھا۔

"بولی ہی نہیں۔ چپ ہو گئی۔ بالکل چپ"

وہ شوکت کی صورت تکنے لگا۔ آہستہ سے بولا "اچھا" اور پھر وہ بھی چپ ہو گیا۔ بالکل چپ۔

چپڑاسی چائے لے کر آ گیا۔ ایک ایک پیالی بنا کر دونوں کے سامنے رکھی۔ شوکت نے حفیظ کو دیکھا جو گم سم بیٹھا تھا "کیا سوچ رہے ہو، چائے پیو۔" یہ کہا اور فائلوں پر جھک گیا۔

دیر بعد فائلوں سے سر اٹھایا اور حفیظ کو دیکھا جو اپنی چائے ختم کر کے خیالوں میں غرق بیٹھا تھا "یار عجیب بات ہے" قلم رکھتے ہوئے بولا۔

"کیا؟" وہ چونک سا پڑا۔

"تمہارے اس قصے کو کتنے سال گزر گئے"

"سالوں کی بات کرتے ہو، ایک جگ بیت گیا۔" لہجہ میں کتنی افسردگی تھی۔

"مگر کتنی عجیب بات ہے۔ تم دونوں ہی کا INVOLVEMENT اب تک اسی طرح قائم ہے"

"کیا" چونکا اور برہم ہو کر بولا۔

http://www.Pakfunplace.com

"میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ ذرا سی ٹھیس لگی تو پھٹ پڑے۔"

اس نے گھور کر شوکت کو دیکھا "تم مجھ پہ WORK کر رہے ہو" اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا جیسے گھبرا گیا ہو کہ ذرا دیر اور ٹھہرا تو ساری قلعی کھل جائے گی۔

جلنے لگا تھا کہ شوکت نے ٹوکا "سنو"

"ہوں"

"اس سے معذرت کر لو"

"معذرت کس بات کی" ایک دم سے اس کا پارہ پھر چڑھ گیا مگر پہلے جتنا نہیں۔

"میرا مطلب ہے کہ وضاحت یہی کہنا ہے تاکہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔"

"نہیں" ایک برہمی کے ساتھ قطعی لہجہ میں کہا اور باہر نکل گیا۔

گھر جا کر سیدھا اپنے کمرے میں۔ جیسے بہت تھکا ہوا ہو کہ لیٹے گا اور نیند آ جائے گی۔ لیٹا، کروٹیں لیں، کتنی دیر آنکھیں موندے پڑا رہا۔ نیند ندارد۔ ایک بیکلی کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت کیا کیا جائے اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اندر اس کے ہو کیا رہا ہے۔ تمہارے اس قصے کو کتنے سال گزر چکے ہیں۔ شوکت کا سوال ذہن میں گونجا۔ اور ذہن کے لئے کہ کتنی دیر سے ایک خالی پن میں بھٹک رہا تھا ایک مصروفیت نکل آئی۔ اس نے اب بیخودگی کے ساتھ گزرے برسوں کو شمار کرنا شروع کیا۔ حیران رہ گیا۔ اچھا اتنے برس گزر گئے اس بات کو۔ لگ یوں رہا ہے کہ کل کی بات ہو۔ کتنے کل ایک دم سے تصور میں گھوم گئے۔ دن کتنے مصروف گزرتے تھے ان دنوں۔ دن بھی اور راتیں بھی۔ دن دن بھر رات رات بھر اسی ایک تصور کے ساتھ چلتے پھرتے رہنا، ساتھ میں دنیا کے سارے کام کاج کرتے جانا۔ کبھی دنیا کے سارے کاموں سے بے نیاز ہو جانا۔ صرف اور محض اس تصور کے ساتھ بسر کرنا۔ ایک پہر، دوپہر، پھر یہ بھول جانا کہ اس تصور کی سنگت

میں کتنے پہر گزر گئے "اور پھر؟" ایک لمبا ٹھنڈا سانس۔ رشتہ جاں تھا کبھی جس کا خیال۔ پھر جیسے وہ کچا سوت تھا کہ بس ایک جھٹکے میں ٹوٹ گیا۔ پھر وہ ذہن سے بسرتی چلی گئی۔ بالکل ہی بسر گئی جیسے تھی ہی نہیں۔ اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں۔ واقعی؟ وہ حیران ہوا۔ تصور میں اسے لانے کی کوشش کی مگر وہ صورت جیسے چشم تصور سے بھی اوجھل ہو گئی ہو اور ان دنوں وہ کیونکر خود بخود تصور میں سماتی چلی جاتی تھی، سمائی رہتی تھی۔ پہروں، دنوں، ہفتوں۔ اور اب؟ اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں۔ واقعی۔ معلوم ہوا کہ تاریخ بھی اپنے آپ کو نہیں دہراتی اور جذبے بھی اپنے آپ کو نہیں دہرایا کرتے۔ جذباتی کیفیتوں سے لبریز وہ ساعت زمانہ ہوا گزر گئی۔ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گی۔ شوکت نے جو کہا سب جھوٹ اور یہ سوچ کر اسے کس قدر اطمینان ہوا۔ ایک احساسِ فراغت۔ فراغت کے اس احساس کے ساتھ کرنے کے کئی کام ایک دم سے یاد آ گئے۔ کتنے جواب طلب خطوط کب سے میز پر اس کی توجہ کے منتظر تھے۔ انہیں الٹا پلٹا۔ جواب لکھے۔ سوچا کہ آج ہی انہیں پوسٹ کر دینا چاہیئے۔ تین چار ضروری فون کئے۔ ایک عدد فون سلیم کو بھی کر ڈالا کہ شطرنج کے کھلاڑی کب دکھا رہے ہو۔ کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ انہیں سمیٹا، ترتیب سے رکھا۔ منی کہ دیر سے کونے میں سوئی پڑی تھی انگڑائی لے کر اٹھی۔ قریب آ کر وہی میاؤں کی پکار۔ اور اس پکار کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ شام ہو چلی ہے اب چائے پینی چاہیئے۔ سیدھا باتھ روم میں۔ نہایا دھویا کپڑے بدلے۔ پھر چائے کی میز پر۔ پرچ میں انڈیل کر دودھ منی کو پلایا۔ پیالی میں بنا کر چائے خود پی۔

چائے پیتے پیتے جانے کیسے بغیر اسے اطلاع کئے ذہن پھر اسی طرف جا نکلا۔ مگر یہ بات تو میں نے کہی نہیں تھی۔ یہ تو اس پر واضح ہو جانا چاہیئے۔ بس اچانک ایک لہر آئی۔ اسی لہر میں اٹھا اور سیدھا شوکت کی طرف ہو لیا۔

"بہت بے چین نظر آ رہے ہو" شوکت اسے دیکھ کر مسکرایا۔

http://www.pakfunplace.com

"میرا خیال ہے کہ میں اپنی پوزیشن واضح کر دوں" وہ سیدھا معاملہ کی بات پہ آیا۔

"کم از کم مجھے یہ واضح کر دینا چاہیئے کہ میں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی۔ باقی اس کے بعد وہ جانے اس کا کام جانے۔ اعتبار نہیں کرتی ہے نہ کرے۔ جہنم میں جائے۔" پھر اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"ٹھیک سوچا تم نے۔ یہی میں کہہ رہا تھا کہ کم از کم تم اپنی طرف سے وضاحت کر دو۔"

"اس سے تم آج مل رہے ہو نا؟"

"ہاں آج اور اسی وقت" شوکت نے کہ جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"پھر تم اس سے کہہ دینا"

"ٹھیک ہے کہہ دوں گا۔"

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

"تم تو جا رہے ہو۔ پھر چلوں" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سنو" شوکت کہہ کر چپ ہو گیا۔

"ہاں۔ کہو"

"کیوں نہ تم چل کر خود ہی اس سے۔۔۔۔۔"

"کیا؟ میں خود۔" اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ چلا اٹھا۔

"کیوں کیا حرج ہے" شوکت نے اسی اطمینان سے کہا "اس بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

"ملاقات؟ کیوں؟ کس خوشی میں"

شوکت نے اس کی بات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کہنے لگا "لوگے تو حیران رہ جاؤ گے۔ عجیب بات ہے۔"

"کیا"

"یار بالکل ویسی ہی لگتی ہے۔"

"نہیں؟"

"صحیح کہہ رہا ہوں۔"

"تمہیں پتہ ہے کہ کتنے برس تب سے اب تک بیت چکے ہیں"

"پتہ ہے جب ہی تو حیران ہوں"

"اچھا" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ تجسس کچھ حیرت اور اچانک وہ صورت تصور میں ابھر آئی۔ وہ پورا سراپا۔

شوکت نے گاڑی سٹارٹ کی۔ دروازہ کھولا۔ اعتماد سے کہا "آؤ بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھ گیا۔ بغیر کسی پس و پیش کے۔ جانا بھی دور نہیں تھا۔ شوکت گاڑی بھی تیز چلا رہا تھا۔ پھر بھی اسے وہ رستہ بہت لمبا لگا "کیا چیونٹی کی چال چل رہے ہو۔"

"بہت جلدی ہے دیکھنے کی"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شوکت نے بھی رفتار قدرے تیز کر دی۔

گاڑی گیٹ میں مڑنے لگی تھی کہ وہ بدک گیا "ذرا روکو" اور رکتے ہی اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور باہر۔

"کیوں؟" شوکت نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"بس تم جاؤ"

"اور تم؟"

"نہیں یار۔" اور بس پلٹ پڑا اور کتنی تیزی سے وہ اس کوچے سے نکلا۔

اچھی خاصی دور نکل آیا تھا کہ اس کے کان کے برابر زور سے ہارن بجا۔ شوکت نے تعجب سے اسے دیکھا "تم کیوں واپس آ گئے۔"

http://www.pakfunplace.com

"تم نے میرا موڈ آف کر دیا"، دروازہ کھولتے ہوئے "بیٹھو"

دونوں چپ۔ سامنے انٹرکون کو دیکھ کر شوکت نے اس طرف گاڑی موڑ لی "کم از کم چائے تو پی لیں۔"

وہاں بھی اچھی خاصی دیر تک خاموشی رہی۔ آخر اس نے ہی پریشان ہو کر خاموشی کو توڑا۔ "تمہارے ویزا کا مسئلہ کس منزل میں ہے۔"

"اب شاید حل ہی جائے۔ بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہے"

"دلی تو جاؤ گے ہی نا؟"

"اصل میں تو دلی ہی جانا ہے۔ وہیں دن گزریں گے۔ اپنے شہر کا تو بس پھیرا لگانا ہے۔ اب وہاں ملے گا تو کون کون رہ گیا ہے اب وہاں۔ مگر....."

"نہ رہے کوئی۔ شہر تو اپنی جگہ پر ہے ضرور ہو کر آنا۔"

"تم جب گئے تھے تو تم بھی اپنے شہر تو گئے ہو گئے"

تھوڑا گڑبڑا کر "گیا بھی تھا اور نہیں بھی گیا"

"اچھا؟ مگر تم تو بتا رہے تھے کہ تم نے وہاں بہت شہر کھوندے۔"

"ہاں دوسرے شہر۔ مگر جس شہر کی خاطر میں نے یہ سفر کیا تھا وہ شہر ہی رہ گیا۔"

"کیسے؟"

"پتہ نہیں کیسے۔ میں گیا وہاں۔ مگر جب اپنی بستی میں داخل ہونے لگا تو یار میں گڑبڑا گیا۔ میں رستہ بھول گیا یا شاید بستی نے رستہ نہیں دیا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ بس باہر سے باہر ہی پلٹ لیا۔"

"بہت فضول آدمی ہو۔"

"ہاں یار"، افسردہ ہو کر بولا "واقعی فضول آدمی ہوں۔ بعد میں بہت افسوس ہوا۔ اپنے آپ پہ بہت لعنت ملامت کی۔"

اتنا افسردہ ہوا کہ بس پھر چپ ہی ہو گیا۔ دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ شوکت بھی نہیں بولا۔

"یار" دیر بعد سوچتے ہوئے بولا "بستی بھی عورت ہوتی ہے"

"ہوں؟" شوکت جیسے بیان کی وضاحت چاہتا ہو۔

"بات یہ ہے جیسے میری عمر بڑھ رہی ہے اس کی عمر بھی تو بڑھی ہو گی۔ عمر ساتھ ساتھ گزاری ہوتی تو اور بات تھی۔ مگر میں تو اس کی بڑھتی گزرتی عمر میں شریک ہی نہیں رہا۔ میں وہاں جاتا اور اسے نہ پہچان پاتا تو؟ اور وہ تو مجھے کاہے کو پہچانتی۔"

"کس کا ذکر کر رہے ہو؟" شوکت نے الجھ کر پوچھا۔

شوکت کے سوال پر کسی قدر حیران ہوا "بستی کا اور کس کا۔"

"میں سمجھا کہ....." شوکت کچھ کہتے کہتے ایسے ہی رک گیا۔

"نہیں میں اپنی بستی کا ذکر کر رہا ہوں۔ بستی بھی اپنی فطرت میں بالکل عورت ہوتی ہے۔"

"حفیظ" شوکت کو آخر تاؤ آ گیا "تم اپنی بستی کو جانتے ہو گے۔ مگر عورت کے متعلق تم کیا جانتے ہو۔ عورت کو تم نے دیکھا ہے؟"

وہ چپ ہی تو ہو گیا۔ جب بولا تو اس طرح کہ بالکل ہی ہتھیار ڈال دیئے "تم نے صحیح کہا..... صحیح کہتے ہو۔"

گھر پہنچ کر بھی اسے حفیظ کی زہر بھری بات یاد آتی رہی اور دل ہی دل میں اقرار "حفیظ صحیح کہتا ہے۔ بالکل صحیح۔ مگر..... مگر میں نے اپنی بستی کو بھی کتنا دیکھا ہے، کتنا جانتا ہے۔ حفیظ میری بستی کے بارے میں، کسی بھی بستی کے بارے میں کیا جانتا ہے۔ بستی بھی عورت ہوتی ہے۔ اتنی ہی گہری، اسی طور پر اسرار۔ بس اسی کے ساتھ دھیان کی ایک لہر آئی اور اسے اس کی بستی کی طرف بہا لے گئی۔ کچے پکے رستے، ٹیڑھی میڑھی گلیاں، گھر، منڈیریں، میدان اور دور سے آتی آواز۔ گھنشام نہیں آئے۔ پورا بول کیا تھا۔ یاد ہی نہیں آیا۔ بس اتنا یاد آیا کہ گھر میں درخت میں ایک جھولا پڑا تھا یاد کرنا چاہا۔ مگر سارا تصور ہی دھندلا دھندلا تھا وہ اداس

http://www.pakfunplace.com

ہوگیا۔ یہ سوچ کر کہ وقت نے اس کی یادوں کو کتنا ماند کر دیا ہے جتنا یاد کرنا چاہا اتنا ہی تصور دھندلاتا گیا۔ اسی حساب سے اداسی بڑھتی چلی گئی۔ کاش، ایک اداسی کے ساتھ اس نے سوچا، میں ان دروں اور دریچوں کو، ان منڈیروں کو، ان مٹیوں کو ایسے ہی یاد رکھ سکتا جیسے چاہنے والا کوئی مرد چہیتی عورت کو اس کے لمبے کالے بالوں گورے گالوں رسیلے ہونٹوں نشیلی آنکھوں کے ساتھ یاد رکھتا ہے۔ عورت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اسے تو اوجھل ہونا ہوتا ہی ہے۔ مگر تصور ان بالوں گالوں ہونٹوں آنکھوں سے کتنا شاد آباد رہتا ہے اے میری بستی، تو میرے لئے عورت کی مانند ہوگئی کہ تو نے درشن دیئے، رجھایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اے بستی، اے عورت، اے کہ تو اپنے دروں دریچوں بالوں گالوں کے ساتھ۔ اپنے برہ کے گیتوں کے ساتھ۔ بس اسی آن فون کی گھنٹی بجی کہ ساتھ اس کے لہر تتر بتر ہوگئی۔

"ہیلو۔ سلیم۔ ہاں۔ اچھا۔ شطرنج کے کھلاڑی۔ کیوں نہیں دیکھوں گا..... کیا کہا۔ سعیدہ۔ اچھا وہ آرہی ہے..... ٹھیک ہے..... ٹھیک..... بس میں تیار ہوا اور آیا۔"

ایک دم سے اس کے اندر ایک رود دوڑ گئی۔ ایک نئی حرارت۔ وہ تو پٹا ہوا سا بیٹھا تھا۔ اب اچانک خود بخود چال اس کے حق میں ہوگئی۔ یہ صورت بہتر نہیں ہے یقیناً بہتر ہے۔ میں خاص طور پر اس سے ملنے تو نہیں جا رہا ہوں۔ میں تو شطرنج کے کھلاڑی دیکھنے جا رہا ہوں۔ سلیم کے گھر۔ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ بھی یہاں آرہی ہے اور اس نے پھرتی سے منہ ہاتھ دھویا، کپڑے بدلے، بال بنائے، آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا۔ میں بھی زیادہ بدلا تو نہیں ہوں۔ بس ذرا بال..... خیر یہ کوئی بات نہیں اور جوتے کے تسمے باندھتے باندھتے اس کے ردعمل کو دھیان میں لایا۔ مجھے دیکھ کر کیا کہے گی مگر اس کے پاس اس وقت سوچنے کا زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ تو فرصت کی باتیں ہوتی ہیں اور اسے بھاگم بھاگ سلیم کے گھر پہنچنا تھا۔

تیر کی طرح گھر سے نکلا۔ گزرتی ہوئی رکشہ کو آواز دی۔ مگر رکشہ والے نے اس کی آواز پر دھیان ہی نہیں دیا۔ سخت غصہ آیا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ ٹیکسی برابر سے گزری اور اس کے اشارے پر رک بھی گئی۔ کتنی پھرتی سے ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی والے کو ہدایت کی "ماڈل ٹاؤن" گیٹ کے باہر ہی اس نے ٹیکسی رکوائی۔ میٹر دیکھ کر پرس سے روپے نکال رہا تھا کہ برابر سے ایک گاڑی گزری اور گیٹ میں داخل ہوگئی۔ گزرتی گاڑی میں بس ایک جھلک سی اسے نظر آئی تھی اور اس کا دل دھڑکنے لگا کہ کہیں وہی تو نہیں تھی۔ ہاں شاید وہی تھی بالکل۔ اور وہ دبدا میں پڑ گیا۔ کہاں پرس سے اتنی تیزی سے روپے نکالے تھے اور کہاں اب اس نے دوبارہ میٹر دیکھا، نوٹوں کو درست کیا، گنا، گن کر دینے لگا تھا کہ ہاتھ روک لیا۔ "اچھا واپس چلو" ٹیکسی میں پھر سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"واپس؟"

"ہاں واپس۔"

"کہاں"

"جہاں سے آئے ہیں۔"

واپس وہ اس طرح آیا جیسے چال الٹ گئی ہو۔ دیر تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے یہ غلط کیا یا صحیح کیا۔ سوچا کہ اسی میں اس کی جیت ہے۔ مگر جیت کے احساس کو زیادہ دیر تک وہ برقرار نہ رکھ سکا۔ اسے لگا کہ وہ ہار گیا ہے۔ مگر میں تو پہلے ہی ہار چکا تھا۔ اب نہ ہار رہے نہ جیت ہے۔ میں خواہ مخواہ مسئلہ کو بڑھا چڑھا رہا ہوں۔ اس مسئلہ کو جواب مسئلہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو برسوں ہوئے پٹ چکا۔ میں نہ گیا تو کیا ہوگیا۔ چلا جاتا تو کیا ہو جاتا۔ مگر اور ایک مرتبہ پھر اس کے ذہن میں سوال ابھرا، اگر یہ مسئلہ نہیں تھا تو میں نے اسے مسئلہ بنایا کیوں۔ آخر میں جاتے جاتے کیوں پلٹ پڑا۔ سادگی سے چلا جاتا کیا ہو جاتا۔ آخر کیوں نہیں گیا۔ بس حماقت۔ مگر چلا جاتا تو وہ زیادہ بڑی حماقت ہوتی۔ میں نے تو اسے ایک ساعت میں

http://www.pakfunplace.com

دیکھا تھا وہ ساعت گزر گئی، وہ اوجھل ہوگئی۔ خواب بن گئی وہ بھی، وہ ساعت بھی۔ آج کی ساعت غیریت کی ساعت ہے کیا عجب کہ پچھلی ساعت بھی ہاتھ سے نکل جاتی اور خواب اتنا شاداب خواب بکھر جاتا۔ میں نے ٹھیک کیا۔ بات صاف ہوگئی۔ اب مجھے آرام سے سو جانا چاہیئے۔

جیسے واقعی بات صاف ہوگئی ہو اور معاملہ طے ہوگیا ہو، اس نے کپڑے بدلے اور بس اپنے بستر میں مگر آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ ایک لہر اٹھی اور اسے کہاں بہا کر لے گئی۔ کچے پکے رستے، ٹیڑھی میڑھی گلیاں، ڈیوڑھیاں، در، دریچے، منڈیریں، ممٹیاں، آنگن، آنگن میں کھڑا پیڑ، پیڑ میں پڑا جھولا۔ سب کچھ کتنا منور تھا، کتنا جیتا جاگتا۔ کتنی وضاحت کے ساتھ اسے بھولے بسرے گیتوں کے بول یاد آتے چلے گئے۔ جیسے کبھی حافظہ سے اترے ہی نہیں تھے۔ ایک گیت، دوسرا گیت، تیسرا گیت۔ ہر گیت برہ کا گیت۔ وہ حیران رہ گیا۔ یہ تو سب گیت برہ کے گیت ہیں تو اس بستی کے سب ہی گیت برہ کے گیت تھے۔ وہی ایک درد۔ جدائی کا دکھ، دوری کا رونا، جیسے ازل اور ابد کے بیچ ایک ہی داستان چل رہی ہے، ایک ہی گیت گونج رہا ہے، جدائی کی داستان، برہ کا گیت، نارسائی کا نوحہ۔ بس اس خیال کے ساتھ وہ سارا منظر جو اس کے تصور میں اچانک منور ہوگیا تھا۔ دھندلاتا چلا گیا۔ کتنی دیر وہ اس منظر کے بیچ گم رہا تھا جیسے کسی نرم آغوش میں ہو۔ مگر اب پھر اداسی کی گھٹا دل و دماغ پہ چھا چلی تھی۔ عالم وہی کچھ سونے کا کچھ جاگنے کا اور اداسی کی گھٹا تھی کہ گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اندر ہی اندر اٹھتی ہوئی دکھ کی ایک لہر ــــ اب میرا رشتہ اس کے ساتھ نہیں، اس کے خواب کے ساتھ ہے اور وہ آدھے سوتے آدھے جاگتے میں بڑبڑایا۔ اے بستی، اے عورت۔۔۔۔۔۔۔۔

اجنبی پرندے

شکل اس کی گھڑی گھڑی بدلتی کبھی روشندان کی حد سے نکل کر تنکوں کا جھومر دیوار پہ لٹکنے لگتا، کبھی اتنا باہر سرک آتا کہ آدھا روشندان میں ہے۔ آدھا خلا میں معلق، کبھی اکا دکا تنکے کا سرکتی کہ تنا اور روشندان سے نکل چھت کی طرف بلند ہوا اپنے وجود کا اعلان کرتا چڑیا چڑا گھونسلے سے نکل روشندان کے کنارے بیٹھ جاتے اور دھیمے میٹھے شور سے کمرہ بھر جاتا۔ چڑے کے روئیں روئیں میں بجلی کی رو چلتی دکھائی دیتی۔ چڑیا پہ ایک نشے، ایک سپردگی کی کیفیت کہ وہ رو جب اس کیفیت میں شامل ہوتی تو الگ الگ وجود ختم ہو جاتے اور ایک گرم دھڑکتی ہوئی پروں کی ننھی سی پوٹلی باقی رہ جاتی۔ کبھی چڑیوں کا ایک غول ہو جاتا اور یہ شور مچاتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ باہر سے کھنچ کھنچ کر آتیں، روشندانوں میں دروازوں کے کنگوروں پر، طاقوں میں، آتشدان پہ، بس سمجھو کہ کمرہ چڑیوں سے بھر جاتا اور وہ چیں چیں ہوتی گویا چڑیوں میں بلوہ ہوگیا ہے۔ کوئی دو چڑے گتھم گتھا ہو جاتے، لڑتے لڑتے روشندان سے پھسلتے، بھد سے فرش پہ آگرتے، ایک فرش پہ چت گرے ہوئے، دھڑکتے ہوئے پوٹے، چونچیں کھلی ہوئیں، لگتا کہ ہانپتے ہانپتے چل بسیں گے کہ ذرا کھٹکا ہوا، پھریری لی، آن کی آن میں پھر سے اڑ روشندان سے باہر نکل یہ جا وہ جا، ساتھ میں چڑیوں کا موج نموج مجمع بھی رخصت ہو جاتا اور کمرے میں ایک دم سے خاموشی چھا جاتی۔

کمرے کی عجب حالت تھی۔ ہر طرف تنکے بکھرے ہوئے۔ آتشدان پہ، چاندنی بستر میں کتابوں کی میز پہ، کرسیوں پہ، کہیں اکا دکا کہیں ڈھیری کی ڈھیری، فرش پہ چیتھڑے گودڑ تنکوں کے ساتھ الجھے ہوئے سوکھی گھاس کا کوئی بڑا سا گچھا آوارہ آوارہ، کبھی فرش کے بیچوں

http://www.pakfunplace.com

بیچ، کبھی ہوا کے سہارے سرکتا سرکتا کرسی کے نیچے سے پلنگ کے نیچے کئی مرتبہ اس نے بانس اٹھایا کہ گھونسلے کو روشندان سے پھینک دے۔ مگر اماں جی نے ٹوک ٹوک دیا۔ "نا بیٹا چڑیوں کو نہیں ستاتے ہیں۔"

"اور چڑیاں ہمیں ستاتی رہیں؟"

"ستا دیں یا نہ ستا دیں، پر گھونسلہ تو نہیں اجاڑنا چاہیئے۔ آخر ہوا کیا، لا میں جھاڑ دیئے دوں۔"

اور وہ جھاڑو لے کر کھڑی ہو جاتیں۔ سارے کمرے میں جھاڑو دیتیں۔ کتابوں کی میز سے آتشدان سے، بستر پوش سے تنکے چنتیں، جھاڑن سے ایک ایک چیز کو جھاڑتیں۔ کمرہ صاف ستھرا ہو جاتا۔ مگر جب تیسرے پہر کو وہ دفتر سے واپس ہوتا اور کمرے میں قدم رکھتا تو پھر وہی بکھرے ہوتے تنکے، وہی گھاس پھونس، ننھے چیتھڑے گودڑ سے تنکوں میں الجھے ہوئے کتابوں پہ جا بجا بیٹھیں۔

"بڑی آفت ہے یہ تو، ان چڑیوں نے تو ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"بیٹا چڑیاں آبادی کی نشانی ہیں۔ اجاڑ گھروں میں ابابیلیں رہتی ہیں۔ چڑیاں تو بھرے گھروں میں ہی رہتی ہیں۔" اسے وہ پرانا گھر وہ گیا وقت یاد آ جاتا جب گھر بھرا ہوا تھا۔ دالان کی خمیدہ کڑی میں تو خیر دو گھونسلے تھے ہی، ایک گھونسلہ بڑے کمرے کے چھت کو چھوتے ہوئے بدرنگ ہرے شیشے والے روشندان میں تھا۔ ایک گھونسلہ زینے کی گرد سے اٹی میلی چھت میں تنکوں اور گودڑ کی صورت میں۔ خُلا جتنا چتیوں والا خاکستری انڈا کبھی زینے کی سیڑھیوں پہ، کبھی دالان کے فرش پر خمیدہ کڑی کے نیچے، کبھی کمرے میں روشندان تلے ٹوٹا پڑا نظر آتا۔ کبھی چتیوں والا خاکستری انڈا، کبھی گوشت کا ننھا لوتھڑا ایسا چڑیا کا بچہ کہ ہاتھ لگانے سے پچ پچ کرتا۔ سویرے سویرے جب اس کی آنکھ کھلتی تو دالان اور زینے اور کمرے والی اپنی چڑیاں اور دور کے گھروں سے آئی ہوئی رنگ رنگ کی پرائی چڑیاں سامنے والی منڈیر پہ پھدکتی

شور کرتی دکھائی دیتیں۔ کبھی منڈیر پہ، کبھی منڈیر سے آنگن میں، جہاں ٹاٹ کے ملیے بورئیے پر رحلیں جمائے سیپارے کھولے لڑکیوں کی ایک قطار لگی ہوتی۔ والتین والزیتون۔ وطور سینین وہذا البلد الامین۔ سبق اس زور زور سے یاد کیا جاتا کہ سارا آنگن گونجتا۔

"نعیمہ، چلو چڑیا پکڑیں۔" نعیمہ اماں جی کو غافل دیکھ سیپارہ آہستہ سے بند کر چپکے سے ساتھ ہو لیتی۔ زینہ چڑھ چھت پہ پہنچتے۔ بورئیے کو چھوٹی سی کھپچی کے سہارے ٹکایا، نیچے گیہوں کے دانے بکھیرے، کھپچی میں لمبی سی ڈور باندھی اور ڈور کا دوسرا کنارا تھام زینے کی دیوار کے پیچھے چھپ گئے گھٹے ملے بیٹھے ہیں اور نظریں بورئیے پہ جمی ہیں۔ چڑیاں کتنی چالاک ہو گئی تھیں کہ باہر کے دانے چگتیں، بورئیے کے پاس جاتیں اور پھر ہٹ جاتیں دیر گزر جاتی اور چھوتے ہوئے جسم پسینے میں بھیگنے لگتے اور وہ بیٹھے رہتے، اسی طرح گھٹے ملے نظریں اسی طرح بورئیے پہ جمی ہوئیں۔ کوئی چڑیا بہت بہادری دکھاتی اور عقلمندی کہ بورئیے کے قریب جا کر ننھی گردن گھما پھرا اوپر نیچے دیکھتی، چونچ بڑھا کر اندر سے ایک دانہ چگتی پھر پیچھے ہٹ جاتی۔ پھر پھدک اک ذرا اور اندر جاتی، ایک دانہ چنتی اور پھر باہر اور اس کے بعد اطمینان سے دانہ چگنے لگتی، چگتے چگتے اندر چلی جاتی۔ کھٹ سے بورئیا گر پڑتا۔

"اہاہا پکڑی گئی۔ چڑیا پکڑی گئی"

"اری چپ۔ اماں جی سن لیں گی"

پھر وہ ہولے ہولے بورئیے کے پاس گئے۔ احتیاط سے چڑیا کو پکڑا۔

"ارے میں بتاؤں ایک بات چڑیا کو رنگ لیں۔"

نعیمہ کی تجویز اسے بہت بھائی۔ ہولے ہولے نیچے گیا، دبے پاؤں دالان میں جا طاق سے گلابی پڑیا اٹھا جیب میں رکھ، چپکے چپکے کنکھیوں سے اماں جی کو کہ گھڑونچی سے پرے لڑکیوں کو سبق دینے میں مصروف تھیں دیکھتے ہوئے گھڑے سے کٹورا اٹھایا، پانی سے بھرا، دبے پاؤں زینے میں، زینے سے جلدی جلدی اوپر۔ نعیمہ نے پڑیا پانی میں گھولی،

http://www.pakfunplace.com

پھر چڑیا کو پکڑ کٹورے میں ڈبکیاں دیں۔

"بھئی بس کرو چڑیا بھیگ گئی۔"

چڑیا کو بھیگا دیکھ کر اس کا دل جانے کیوں پسیجنے لگا۔ پر بھیگ کر لٹک سے گئے تھے۔ اور وہ بجلی ایسی رو، وہ حرارت کہ اس پدی سی جنے کو ہر دم حرکت میں رکھتی تھی مندی پڑ گئی تھی۔ اسے ترس آنے لگا "بھئی چھوڑ دو، چڑیا مر جائے گی۔"

وہ بہت ہنسی "باول خاں چڑیا کہیں رنگنے سے بھی مرتی ہوگی۔ اب وہ سرخ ہو جاوے گی۔ ذرا سوکھ جاوے پھر دیکھیو۔"

"تو بھئی اسے سوکھ جانے دو۔ اسے دھوپ میں بٹھا دو۔"

نعیمہ نے اسے دھوپ میں بٹھا دیا۔ اس کے بازو بھیگ کر کیسے لٹک گئے تھے، جیسے ساڑھی اور چولی اور انگ انگ ہولی کے رنگ سے شرابور ہوگیا ہو اور دو قدم چلنا دوبھر ہوا ہو۔ پھر بھی نعیمہ نے خبردار کر دیا تھا "سوکھ جاوے تو فوراً پکڑ لیجیو نہیں تو اڑ جاوے گی۔"

چڑیا رنگ میں بھیگی اونگھتی رہی۔ پھر اس نے پھریری لی، پروں کو پھرتی سے جھٹکا اور پھر سے اڑ منڈیر پہ جا بیٹھی۔

"ارے اڑ گئی۔" نعیمہ چلائی۔ پھر دونوں نے دوڑ لگائی۔ لیکن چلانا اور دوڑنا دونوں کام نہ آئے۔ چڑیا منڈیر سے اڑی اور دم کے دم میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

"اڑ گئی۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

سر نیوڑھائے منہ لٹکاتے ہولے ہولے قدم اٹھاتے واپس ہوئے اور زینے کی چوکھٹ پہ بیٹھ گئے۔ دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ پھر نعیمہ نے اپنے گلابی ہاتھ دیکھے اور دیوار سے رگڑنے شروع کر دیئے۔

"اب پتائی ہوگی۔"

نعیمہ نے اس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا، ہاں ہتھیلیوں کو دیوار پہ اور زیادہ سختی

سے رگڑنا شروع کر دیا۔

اس نے اس کے گال کو گھور کے دیکھا، پھر ہنس پڑا "گال پہ بھی لالی لگ رہی ہے۔"

نعیمہ کا ہاتھ جلدی سے گال پہ گیا۔ گلابی انگلیاں گال پہ چلیں تو گال اور لال گلابی ہوگیا اور وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا "پگلی تیرے ہاتھ تو سرخ ہیں گال پہ اور لالی لگ گئی۔"

وہ روٹھنے والی ہوگئی۔

"لا میں چٹا دوں"، اس نے پوروں کو تھوک سے گیلا کر اس کے گال پہ ملا۔ وہ الگ سرک گئی "نہیں بھئی ہم خود صاف کر لیں گے"، اور اس نے کرتے کے دامن کو ہونٹوں سے گیلا کیا اور گالوں کو ملنا شروع کر دیا۔

اس نے اپنے پوروں کو دیکھا کہ لال گلابی ہو چلے تھے، لال گلابی پوروے کہ اب ان میں نرم نرم مٹھاس سا بہہ رہا تھا، اس نے لال گلابی پوروں کو ہونٹوں سے تر کیا اور کرتے پہ ملنے کو تھا کہ رکا۔ لال گلابی پوروں میں، باہر اور اندر، نرم نرم مٹھاس بہہ رہا تھا۔ جی اس کا چاہا کہ پھر ان لال گلابی گالوں کو لال گلابی پوروں سے چھوئے۔ مگر نعیمہ گھبراہٹ میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی "بھئی دوپہر ہوگیا ہمارا سبق یاد نہیں ہوا ہے"...... اور چڑیوں کا غول کا غول کمرے میں گھس آتا اور وہ غل مچاتا کہ یادیں اس کی تتر بتر ہو جاتیں۔ اس کی یادیں بھی عجیب تھیں کہ کسی مبہم سے اشارے پر ماضی کے دھندلکوں میں گم آشیانوں سے اڑ اڑ کر قطار در قطار آتیں اور جھرمٹ بن کر اترتیں اور ہلکے سے کھٹکے پر بھرا کر اڑ جاتیں اور وہ پھر خالی آنگن ایسا ویران ہو جاتا۔ خالی کمرے میں وہ، اس کی کتابیں، حرارت سے محروم، اکیلا بستر۔ روشندان میں بیٹھا ہوا چڑا کچھ دیر اکیلا بیٹھا چلاتا رہتا، پھر آپ ہی آپ اڑ جاتا۔ اکیلے چڑے کی آواز کہ یادوں کے جمگھٹے میں قُلقہ بن کر گرتی اور تتر بتر کر دیتی اور کبھی یادوں کا بلاوا بن جاتی۔ گلابی چڑیا تو ادبدا کر یاد آتی کہ اس کے ہاتھ سے نکل کر بھی اس کی ہی رہی۔ کالی ڈاڑھی سفید پیٹے والے چڑوں اور خاکستری چڑیوں کے حلقے میں یوں لگتی کہ لال پری ہے اور وہ اور نعیمہ دونوں

http://www.pakfunplace.com

غل مچاتے کہ "وہ دیکھو، ہماری چڑیا"، اور گلابی چڑیا شاید تاڑ جاتی کہ شاید اس پر انگشت نمائی ہو رہی ہے اور چہچہاتے چہچہاتے جھینپ سی جاتی، پھر بلا وجہ بلا سبب اس حلقے سے باہر نکل پھر سے اُڑ جاتی۔ وہ گلابی چڑیا کیا ہوئی، کب اور کیسے آنکھوں سے اوجھل ہوئی، وہ بہت یاد کرتا کچھ یاد نہ آتا بیتے دنوں گزرے سموں میں کوئی ترتیب کوئی تسلسل نہیں تھا۔ انمل بے جوڑ یادیں، گڈمڈ ہوتی ہوئی دوپہریں شامیں صبحیں، گھلے ملے مٹے مٹے سائے کہ جن میں سے ایک گلابی گلابی سایہ ابھرتا، تصور میں منڈلاتا رہتا اور پھر مٹے مٹے سایوں میں گھل مل جاتا۔ نعیم خود اب اس کے ذہن میں ایک مٹا مٹا گلابی سایہ تھی۔ کب نظروں میں سمائی، کیسے آنکھوں سے اوجھل ہوئی کون گھڑی کوئی دن یوں اسے یاد نہ تھا کہ وہ اسے چٹکی میں پکڑ لیتا، حافظہ میں محفوظ کر لیتا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس نے قرآن کب ختم کیا تھا، کیا بھی تھا یا نہیں، کیا تھا، نہیں کیا تھا تو کون سے سپارے سے پڑھنا چھوڑا۔ بس اتنا یاد تھا کہ اس نے پڑھنے آنا چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھار کسی کام سے آ نکلتی تو بس گھڑی دو گھڑی کے لئے اس سے دور دور اماں جی کے پاس آنا، بات کرنا، دم کے دم میں چلے جانا۔ دور دور سے وہ اسے دیکھتا یوں جیسے کبھی پاس سے دیکھا ہی نہ ہو۔ لمبی کتنی ہو گئی تھی وہ پھر اس کا پردہ ہو گیا.... چڑیا اچانک سے کمرے میں آ جاتی، لگتا کہ لمبا سفر کر کے آ رہی ہے اور چڑا اس شور سے اس کا استقبال کرتا کہ کمرہ چیں چیں کے نرم شور سے بھر جاتا اور تصور میں تیرتا گلابی سایہ پھر کسی پردے میں چھپ جاتا۔

پھر ایک روز کیا ہوا کہ دفتر سے واپس ہوا تو دیکھا کہ چڑیوں نے سراسیمہ شور سے گھر کو اٹھا رکھا ہے۔ آتشدان پر، کرسی پہ، فرش پہ جا بجا بیٹھی ہیں، مگر جو جہاں ہے پریشان ہے۔ اس کے داخل ہونے سے وہ پریشان مجمع تتر بتر ہو گیا۔ کچھ باہر اڑ گئیں۔ ایک چڑیا آتشدان سے اڑ کر کنواڑ پہ جا بیٹھی۔ روشندان والا چڑا فرش سے اٹھا اور روشندان میں جا بیٹھا مگر اسی طرح بے تاب اور بے قرار۔ پھر تھوڑی دیر میں کونے میں رکھی ہوئی بڑی الماری کے پیچھے سے بہت باریک بہت نحیف چوں چوں کی آواز آنی شروع ہوئی۔ الماری کے

پیچھے جھانکا تو اندھیرے میں ایک ننھی سی شے حرکت کرتی چوں چوں کرتی دکھائی دی۔ دل میں آیا کہ بچے کو اٹھا کر روشندان میں رکھ دے پر رک گیا۔ کب کی بات یاد آئی تھی اسی طرح روشندانوں طاقوں دریچوں میں چڑیاں جمع تھیں اور آسمان سر پہ اٹھا رہی تھیں وہ بے پروں کا ننھا سا لوتھڑا ابھی ابھی کڑی والے گھونسلے سے پٹ سے گرا تھا۔ اسے ترس آ رہا تھا کہ بے چارے کو اتنی زور کی چوٹ آئی ہے۔ نعیم گھٹنوں پہ جھکی، پھر بیٹھ کر دیکھنے لگی، پھر آدھا لیٹتے ہوئے اپنا کان بچے کے بالکل برابر کر دیا۔ مگر اس احتیاط سے کہ بچے کو چھو نہ جائے۔

"نعیم، بچہ زندہ ہے؟"

"ہاں زندہ ہے۔" پھر وہ اٹھتی بولی "اسے گھونسلے میں رکھ دیں۔"

اس نے جھک کر آہستہ سے بچے کو اٹھایا۔ جنگلے پہ چڑھا۔ نعیم نے اپنے ہاتھوں میں اس کے پیر تھام رکھے تھے۔ پھر ایک پاؤں جنگلے پہ دوسرا پاؤں نعیم کے کندھے پہ رکھا۔ ایک گرم میٹھی نرمی تلوے میں، تلوے کی راہ سارے بدن میں چڑھ رہی تھی۔ جی اس کا چاہ رہا تھا کہ تلوا اسی انداز سے ٹکا رہے، گرم میٹھی نرمی میں اترتا چلا جائے۔ پر اس کا ہاتھ کڑی تک جا پہنچا تھا۔ احتیاط سے بچے کو گھونسلے میں رکھا اور دم سے نیچے کود پڑا۔

"اچھا بھئی اب باہر چلیں۔ چڑیا اسے چگا کھلا دے گی۔" دونوں دالان سے آنگن میں آنگن سے باہر گلی میں نکل گئے۔ دیر تک گلی گلی گھومتے رہے اور بچے کے مستقبل پہ سوچ بچار کرتے رہے۔

دیر بعد پلٹے، دالان میں قدم رکھا تھا کہ ٹھٹھک گئے۔ چڑیا کا بچہ، بے پروں کا بے جان گوشت کا لوتھڑا پھر گرا پڑا تھا اور چیونٹیوں کی لمبی قطار دور تک چلتی نظر آ رہی تھی۔

"مر گیا۔" نعیم دبی آواز میں بولی۔

دونوں کھڑے رہے، چپ چاپ دیکھتے رہے، اس بے جان ننھے لوتھڑے کو چیونٹیوں کی چلتی ہوئی لمبی قطار کو۔ پھر پلٹے اور دبے قدموں کہ آہٹ نہ ہو، دھیرے دھیرے

http://www.pakfunplace.com

باہر نکل گئے...... تیزی سے گھومتی ہوئی پھرکنی کی سی آواز سنے پھر رخنہ ڈالا۔ روشندان سے اترتی ہوئی چڑیا پھر سے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزری، الماری کے پیچھے گئی، بچہ چوں چوں کرتا باہر نکل آیا۔ ننھا سا منہ کھلا۔ چڑیا نے چگا دیا اور پھر اڑ کر روشندان میں چلی گئی اسے یونہی خیال سا آیا کہ گھونسلا عجب ملک ہے کہ اس کی سرحد کو جو وقت سے پہلے پھلانگ گیا واپس نہ آیا۔ اس دیس سے جو نکل گیا وہ نکل گیا سو واپسی کے رستے بند ہیں۔ کچھ عجب طرح کا خیال تھا کہ دل اداس سا ہو گیا اور وہ جھکی ہوئی چھتی ہوئی کالی کڑیوں والا لمبا دالان، پٹڑے نکلی میلی چھت والا زینہ، وہ چھتیں، وہ گلیاں دیر تک یاد آتی رہیں۔

دیر دیر کمرے میں خاموشی رہتی۔ بستر پہ کوئی تنکا گرتا نہ کوئی چوں چوں کی آواز ہوتی۔ پھر دروازے کی اوپر والی چوکھٹ کے آس پاس پروں کی آہٹ ہوتی۔ صورت سے تھکی ہاری سی جیسے کہیں دور سے چل کر آتی ہے، کنواڑ پہ بیٹھتی، روشندان میں جاتی، پھر اسی طرح جیسے پھرکنی گھر رگھر کرتی ہے نیچے اترتی چھپاتی، اور الماری کے پیچھے سے چڑیا کا بچہ منہ کھولے بے تاب ہو کر نکلتا اور چونچ سے چونچ بھڑا دیتا۔

پھر وہ الماری کے پیچھے سے خود ہی نکل آتا، چیں چیں کرتا رہتا اور لمبی اڑان لیتا کہ فرش سے دو تین انچ اونچا اڑتا چلا جاتا اور کہیں کمرے کے دوسرے کونے میں دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرتا پھر اونچا اڑتا اور کبھی کرسی پہ کبھی بستر پہ کبھی عین اس کے سر کے برابر تکیے پہ آ بیٹھتا مگر فوراً ہی پھر اڑتا اور میز پہ جا بیٹھتا بہت اونچا اڑا تو آتشدان پہ جا بیٹھا۔ اس سے اونچا اڑنے کی سکت اس میں کبھی نہ دیکھی گئی۔

انہیں دنوں دورہ نکل آیا۔ باہر چلا گیا۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتے کے بعد واپس آیا تو دفتر میں رکے ہوئے کام کو نبٹانا دوبھر ہو گیا۔ صبح سویرے گھر سے نکلتا اور شام پڑے جب بچے کھیل کود سے تھک ہار کر گھروں کو واپس ہو رہے ہوتے اور گلی خاموش ہو چلی ہوتی پلٹتا۔ دنوں بعد جب دفتر کے کام سے ذرا فراغت ہوئی اور گھر پہ زیادہ وقت گزرنے لگا تو احساس ہوا

کہ کمرہ خاموش ہو گیا ہے۔ روشندان میں گھونسلا بدستور جما تھا، جم گیا تھا۔ فرش پہ، کرسیوں پہ، اس کے بستر پہ کوئی تنکا گرا پڑا دکھائی نہیں دیتا تھا اور کمرہ سرد سرد رہنے لگا تھا۔

گھر میں سفیدی ہوئی تو اس کے کمرے کا سارا سامان نکل کر آنگن میں آ گیا۔ مگر شام کو جب وہ پلٹا تو سفیدی کرنے والے جا چکے تھے۔ کمرے کی دھلائی پتائی ہو چکی تھی اور سامان قرینے سے جما دیا گیا تھا۔ چھت کے قریب کونوں میں تنے ہوئے جالے، دیوار پہ جا بجا اکھڑا ہوا چونا، سب غائب تھا۔ کمرہ قلعی ہو کر اُجلا سا نکل آیا تھا۔ روشندان بھی صاف ہو گئے تھے۔ سامنے والے روشندان سے تنکوں کا وہ مردہ انجر پنجر بھی صاف ہو گیا تھا۔

کمرہ صاف شفاف رہتا۔ گھر میں ایسے کون سے بال نچے تھے کہ چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے۔ نئی نئی سفیدی ہوئی تھی، چھت اور دیواروں سے بھی گرد نہیں جھڑتی تھی کئی کئی دن تک فرش کو جھاڑو نہ لگتی اور فرش اجلا دکھائی دیتا۔ اماں جی کو بس عادت سی تھی کہ دوسرے تیسرے دن جھاڑو لے کر کھڑی ہوتیں اور جھاڑن سے ایک ایک چیز صاف کرتیں۔ مگر اگلے سے اگلا اتوار آیا تو دیر تک سوتے کے بعد دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تو لحاف پہ کئی تنکے بکھرے پڑے تھے سامنے کے روشندان سے گھومتی ہوئی بغلی روشندان پہ اس کی نظر پڑی اب کے گھونسلا بغلی روشندان میں بنایا تھا، عین اس کی پائنتی کے اوپر کمرے میں دیکھا کہ دو تین تنکے تازہ تازہ بستر پہ بکھرے ہیں اور اکا دکا بیٹ اجلی اجلی۔ اس کی نظریں سامنے کے روشندان پہ اٹھ گئیں مگر روشندان خالی تھا۔ اس کی نظریں سامنے کے روشندان سے ہٹ کر دیواروں کے مختلف گوشوں میں گھومتی ہوئی بغلی روشندان پہ جا ٹکیں کہ اب کے گھونسلا وہاں بنایا گیا تھا، عین اس کی چارپائی کے اوپر۔ تنکے، سوکھے زرد مگر تازگی اور گرمائی کا رنگ لیے، قرینے سے جمع ہوئے۔ کمرے میں پھر گرمائی سی پیدا ہو گئی تھی پھر دل کے صحن میں نئی چھن کے ساتھ یادیں اترنے لگیں جیسے کسی مبہم سے اشارے پر ماضی کے دھندلکوں میں گم آشیانوں سے اڑ اڑ کر قطار قطار آئیں اور ان کے جھرمٹ سے ایک مٹا مٹا گلابی سایہ پھر اسی طرح ابھرتا گھرتا تصور میں دیر تک منڈلاتا رہتا اور ہلکے سے کھٹکے پر یادوں کے ساتھ تتر بتر ہو جاتا

http://www.pakfunplace.com

برہمن بکرا

دکن دیس میں نربدا ندی کے کنارے ایک برہمن رہتا تھا ہر طرح کے سکھ آنند میں تھا۔ بس ایک دکھ تھا کہ اس کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک سنت گھومتا پھرتا اس گاؤں میں جا پہنچا۔ یہ برہمن اس کے پاس پہنچا۔ چرن چھوئے اور بولا "سنت جی، کچھ مجھ پہ بھی کرپا کرو۔ میرے کوئی بیٹا نہیں ہے۔"

سنت نے کہا "دیوی پہ بکرا چڑھا۔ دیوی تجھے پتر دے گی۔"

برہمن نے وہاں سے لوٹ کر ترنت ایک بکرا خریدا۔ اسے خوب میوہ کھلایا کہ موٹا ہو جائے کہ دیوی موٹے بکرے کے بدلے میں موٹا سا بیٹا اسے دے۔ بکرا میوہ کھاتے کھاتے ہنس پڑا۔ ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ برہمن اس کو ہنستا دیکھ کر چکرایا۔ بولا "اے بکرے، تو ہنسا کس کارن؟"

بکرا بولا "اے برہمن میں دونوں کے ہیر پھیر کو دھیان میں لا کے ہنسا۔ کیا سمے کا چکر ہے اور کیا دنوں کا الٹ پھیر ہے کہ تب تو بکرا تھا اور میں برہمن تھا۔ اب میں بکرا ہوں اور تو برہمن ہے۔"

"اے بکرے یہ کب کی بات ہے۔"

"اے برہمن یہ تب کی بات ہے جب راجہ بکرماجیت اجین کے سنگھاسن پہ بیٹھے راج کرتے تھے۔ میں اجین کا نامی گرامی برہمن تھا۔ پالنے والے نے سب کچھ دیا تھا بس ایک بیٹا نہیں دیا تھا اس کا مجھے بڑا دکھ تھا۔ ایک جوگی سے میں نے اپنا یہ دکھ کہا تو اس نے کہا کہ دیوی کو بکرا بھینٹ دے۔ وہ تجھے بیٹا دے گی۔ میں نے جھٹ پٹ ایک بکرا خریدا اور اسے میوے کھلا کر موٹا کیا کہ دیوی خوش ہو اور مجھے موٹا سا بیٹا دے اور اے برہمن وہ بکرا تو تھا۔"

بکرا اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ برہمن بے چارا پھیر میں پڑ گیا۔ چھری جیسے نکالی تھی ویسے ہی رکھ دی۔ دنوں تک اسے کھلاتا پلاتا رہا۔ دنوں بعد ایک دن اس نے پھر چھری نکالی۔ سوچا کہ آج اس کے گلے پہ چھری پھیر و اور دیوی جی کو بھینٹ دو۔ بہت سا میوہ اس کے سامنے رکھا کہ آج آخری بار پیٹ بھر کے کھالے بکرے نے میوے میں منہ ڈالا اور رو پڑا۔

برہمن نے اسے روتا دیکھ کر اچرج کیا اور پوچھا "اے بکرے، تو کس کارن روتا ہے۔"

"برہمن، میں اس کارن روتا ہوں کہ آج تو میرے گلے پہ چھری پھیر رہا ہے۔ کل کوئی دوسرا تیرے گلے پہ چھری پھیرے گا۔"

برہمن ہنسا اور بولا "بکرے، میں اب کونسا بکرا ہوں کہ کوئی مائی کا لال میرے گلے پہ چھری پھیرے گا۔ بکرے کا جنم میں بھول چکا۔ اب تو میں منش جاتی میں ہوں۔"

"ہاں اس سمے تو منش جاتی میں ہے" بکرے نے ٹھنڈا سانس بھرا "مگر میرے گلے پہ چھری پھیرنے کے بعد تو منش جاتی میں نہیں رہے گا۔"

"کیسے نہیں رہوں گا۔"

"برہمن، اور تو میں کچھ جانتا نہیں۔ پر اتنا جانتا ہوں کہ کوئی آدمی خون بہا کر آدمی کی جون میں نہیں رہتا اور جنم جنم کے دکھ اٹھا کر تجھے اتنا پتہ چلا ہے کہ کرموں کا پھل ادا کر ملتا ہے۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔"

برہمن یہ سن کر پھر دبدا میں پڑ گیا۔ چھری جیسے نکالی تھی پھر ویسے ہی رکھ دی۔ پھر دنوں تک اس کی ہمت نہ پڑی کہ چھری نکالے اور بکرے کے گلے پہ تیز کرے۔ بکرا بھی تگڑا ہو گیا۔ مزے مزے سے برہمن کے میووں کی جگالی کرتا رہا۔

آخر ایک دن پھر برہمن نے جھجھری لی۔ چھری کو نکال خوب تیز کیا من ہی من میں کہا کہ یہ بکرا بہت جاتر ہے۔ کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے اور ایسا اپدیش دیتا ہے کہ میں بالکل بکری بن جاتا ہوں۔ اب کے ہنسے یا روئے یا گائے یا اپدیش دے میں اس کی ایک نہیں سنوں گا۔

http://www.pakfunplace.com

بس گلے پہ چھری رکھ دوں گا۔ دیر تک وہ اسی طرح سوچتا رہا۔ اپنے من کو پکا کرتا رہا اور چھری کو تیز کرتا رہا۔ مگر اس نے دیکھا کہ بکرا آج بالکل چپ ہے۔ نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے نہ بولتا ہے۔ بولا "اے بکرے، آج تو بہت چپ ہے تو میرے ہاتھ میں چھری دیکھ رہا ہے اور پھر بھی کچھ نہیں بولتا۔"

بکرے نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "مورکھ سے بات کرنا اپنی بات کو کھونا ہے اور ہونی کو کوئی کب تک ٹال سکتا ہے۔ میرا گلا کٹے ہی کٹے اور تو بکرا بنے ہی بنے۔ ہم دونوں کی گردنیں ایک رسی سے بندھی ہیں۔ بس اتنا ہے کہ کوئی آج کٹے کوئی کل کٹے۔"

برہمن پھڑکنے لگا تھا پر جلدی ہی سنبھل گیا۔ تھوڑا بچار کر کے بولا کہ "اے بکرے تیرا گلا کاٹے بنا تو میں رہ نہیں سکتا، دیوی کو بھینٹ جو دینی ہے۔ پر کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ میں بکرے کی جون میں جانے سے بچ جاؤں اور گلا میرا چھری تلے آنے سے بچ جائے۔"

بکرا سوچ کے بولا کہ "اے برہمن، تو میری اچھا پوری کر۔ پھر میں دیکھوں گا کہ میں تیری اچھا کتنی پوری کر سکتا ہوں۔"

"تیری کیا اچھا ہے۔"

"میری اچھا ہے کہ جب میرا گلا کٹ جائے تو تو گیتا کے آٹھویں ادھیائے کا پاٹھ کر کے ایک چلو پانی مجھ پہ چھڑک دیجیو کہ اس پرکار میں جنم چکر سے نکل جاؤں گا اور مکتی پاؤں گا۔"

"یہ بات ہے تو میں تیری اچھا پوری کروں گا۔"

سو جب برہمن بکرے کے گلے پہ چھری پھیر چکا تو اس نے گیتا کے آٹھویں ادھیائے کا پاٹھ کیا اور پھر ایک چلو پانی لے کر اس پہ چھڑک دیا۔ بکرے نے اسی دم اپنی بکرے والی دیہی چھوڑی اور دیو دیہی میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی بیکنٹھ جانے کے لئے تیار ہوا۔ برہمن سے بولا۔ "اے برہمن، تو نے میرے ساتھ بھلائی کی کہ گیتا کے آٹھویں ادھیائے کا پاٹھ کر کے مجھے جنم چکر سے مکت کیا۔ سو اے برہمن تو کہ بکرے کی جون میں جانے سے جھجکتا ہے، اب تب تک بکرے کی جون میں نہیں جائے گا جب تک تو خود اس کی اچھا نہیں کرے گا۔"

یہ کہہ کر بکرا دیو دیہی میں بیکنٹھ سدھارا۔ برہمن خوش خوش اپنی استری کے پاس گیا۔ اسی رات اس کی استری کو گربھ رہا اور نو مہینے بعد اس نے بیٹا جنا۔ پر ادھر اس نے بیٹا جنا ادھر برہمن کا وقت آ گیا۔

برہمن نے مر کر بندر کی جون میں جنم لیا۔ پر بندر کی جون میں اس نے کوئی سکھ نہیں پایا۔ اس نے ایسے دیس میں آنکھ کھولی جہاں کال پڑا ہوا تھا۔ وہاں آدمی بھوکے مر رہے تھے۔ اسے کھانے کے لئے کہاں سے مل جاتا۔ فاقوں میں کب تک جیتا۔ آخر کو پران چھوڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی بندر کی جون سے نکلا۔ پھر کتے کی جون میں پیدا ہوا۔

کتے کی جون میں اسے بہت خوار ہونا پڑا۔ ایک ایک ہڈی کے لئے اسے کتنے کتوں سے لڑنا پڑا۔ جس کتے سے بھی اس کی لڑائی ہوئی اس نے جھنجھوڑ ڈالا۔ ایک بار ایک گھر میں گیا اور ہنڈیا میں منہ ڈال دیا۔ مالک نے دیکھ لیا۔ ایسا ڈنڈا مارا کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پھر وہ لنگڑاتا ہوا جس گلی سے گزرتا لڑکے بالے اسے اینٹیں مارتے۔ اس طرح بہت مار کھائی۔ آخر کو نڈھال ہو گیا اور دم توڑ دیا۔ پر اس کے بعد پھر نیا جنم لیا اور جنم لیتا چلا گیا۔ کتنی جونیں بدل ڈالیں۔ بہت زمانے بعد اس نے بلی کی جون میں جنم لیا۔ اس جنم میں بھی اسے چین نہیں ملا۔ جس نگر میں اس نے جنم لیا تھا۔ وہاں کے لڑکے بالے بلا کے نٹکھٹ تھے۔ دیا تو ان میں نام کو نہیں تھی۔ جب بھی وہ ان کے ہتھے چڑھ جاتی وہ اس کے گلے میں رسی باندھ کے اسے کھینچے کھینچے پھرتے اور بے طرح مارتے پیٹتے۔ پھر اس نگر کے کتے بھی اس کے پیچھے پڑے رہتے۔ ایک کتے نے تو اسے ایسا بھنبھوڑا کہ اس کے سارے بدن میں گھاؤ پڑ گئے۔ بالکل ادھموئی ہو گئی۔

اس دُردشا میں برہمن بلی نے اپنے جنموں کو یاد کیا اور بہت دکھی ہوا۔ ایک ایک کر کے سارے اگلے پچھلے جنم اس کے دھیان میں ایک دم سے پھر گئے۔ جس جنم کو دھیان میں لایا اسے دکھ بھرا پایا۔ ان گنت جنم ان گنت دکھ۔ جیسے یہ جنم کا رہو، دکھوں کی مالا ہو۔ اس نے

http://www.pakfunplace.com

درد کے ساتھ کہا کہ ہے رام، سکھ کونسی جون میں ہے۔ سکھ اس جنم میں کہیں ہے بھی، یا یہ سارا چکر ہے ہی دکھ درد کا گورکھ دھندا۔ اس آن اس نے جانا کہ جینے کا یہ بکھیڑا کتنا فضول ہے اس کا کوئی ارتھ، کوئی تت ہے ہی نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نیا جنم لے رہے ہیں، اب ہمیں نیا جیون ملے گا۔ مگر بس جون بدلتی ہے باقی کچھ نہیں بدلتا۔ پھر وہی سارے دکھ وہی کٹھنائیاں، کوئی نیا جنم نہیں ملتا۔ جیو اپنے آپ کو بس دہراتا چلا جاتا ہے اور اس دھیان کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ وہ جون بدلتے بدلتے کتنا تھک گیا ہے۔ جینا پھر مرنا۔ پھر جینا پھر مرنا۔ اور پھر جینا اور پھر مرنا۔ یہ کیا جیون ہوا کہ بس جیتے رہو مرتے رہو۔ اس بار بار کے مرنے جینے ہیں رکھا کیا ہے میں نے اتنے جنم لئے، ہر جون میں جیا، ہر دیہی میں بسر کی۔ پر مجھے ملا کیا۔ بس دکھ ملے، درد ملا۔ اس دھیان کے ساتھ اس نے سوچا کہ بہت بھگت لی۔ اب اس بکھیڑے کا انت ہونا چاہیئے اور اسے یاد آیا کہ بکرے نے بیکنٹھ جاتے ہوئے کیا کہا تھا تو مجھے آخر میں تو بکرا ہی بننا ہے۔ پھر میں کس کارن اوٹ پٹانگ جونیں لے رہا ہوں کبھی اس جون میں کبھی اُس جون میں کبھی کتے کی دیہی میں کبھی بلی کی دیہی میں۔ اپنے آپ کو میں کیوں تھکا رہا ہوں مجھے تھک ہار کر بکرا ہی بننا ہے۔ سواب سمے آگیا ہے کہ میں اپنے انجام کو مان لوں اور بکرا بن جاؤں۔ جس بھلے مانس کے پلے پڑوں گا اس سے بنتی کروں گا کہ مہاراج جب میرے گلے پہ چھری پھیر چکو تو کرپا کر کے گیتا کے اٹھویں ادھیائے کا پاٹھ کر کے ایک چلو پانی میری دیہی پہ چھڑک دیجیو۔ رام تمہارا بھلا کرے گا۔ میری مکتی ہو جائے گی۔

بس اس اچھا کے ساتھ برہمن بلی نے پران چھوڑ دیئے اور ترنت ہی بکرے کی جون لی۔

برہمن نے جینے کے چکر سے نراس ہو کر بکرے کی جون لی تھی اور یہ آس باندھی تھی۔ کہ کوئی بھلا آدمی دیوی پہ بھینٹ چڑھانے کے لئے اس کے گلے پہ چھری پھیرے گا اور گیتا کے اٹھویں ادھیائے کا پاٹھ کر کے اور چلو بھر پانی چھڑک کے اسے مکتی دلائے گا۔ پہ وہاں تو کچھ اور ہی چکر چل گیا جس آدمی نے اسے خریدا وہ ایک مداری نکلا۔ اس نے

اسے مار مار کے ڈگڈگی پہ ناچنا سکھایا۔ ایک چار انگل کی تپائی بنائی اور اسے سدھایا کہ چاروں ٹانگیں جوڑ کر اس پہ کھڑا ہو اور تماشا دیکھنے والوں کو سیس نوا کے پرنام کرے۔

مداری نے برہمن بکرے کو اس طرح سدھانے کے بعد اس کا تماشہ دکھانا شروع کیا۔ اس کے پاس ایک بندریا تھی اور ایک یہ بکرا تھا۔ دونوں کو رسی میں باندھ کر نگر نگر لئے پھرتا۔ ڈگڈگی بجا کے بھیڑ اکٹھی کرتا۔ بندریا کو نچاتا، بکرے کو چار انگل والی تپائی پہ کھڑا کر کے اس سے تماشائیوں کو ڈنڈوت کراتا۔ مداری گھومتا پھرتا ایک دن اجین میں جا پہنچا وہاں بازار میں مجمع جمع کر کے اس نے تماشہ شروع کیا۔ برہمن بکرا جس گھڑی چاروں ٹانگیں سمیٹ کر تپائی پہ کھڑا ہوا اور مجمع کے سامنے سر نیوڑھایا تو اس نے دیکھا کہ تماشائیوں میں اس کا بیٹا کھڑا ہے اور اس کا تماشہ دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجا رہا ہے یہ دیکھ برہمن بکرا شرم سے پانی پانی ہو گیا، ترنت تپائی سے اتر آیا۔ پھر مداری نے لاکھ اسے پچکارا ڈانٹا ڈپٹا پر وہ رام نہ ہوا۔ مداری نے لوگوں کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ بکرا آج بندریا سے روٹھ گیا ہے۔

اس شام ڈیرے میں پہنچ کر برہمن بکرا ایسے ڈھیر ہو گیا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو۔ دانہ پانی سامنے آیا تو اس نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ مداری نے بہت تھپکا پچکارا پر اس نے دانے پانی کو منہ نہیں لگایا۔ رات گئے تک چپ پڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ ہے رام یہ میری کیا مایا ہے کہ جس کے جنم کے لئے مجھے بکرے کی جون لینی پڑی وہ بھی میرا تماشہ دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے کیا دنیا اسی کا نام ہے اور جیون بس یہی کچھ ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑبڑایا کہ یہ جنم مجھے سب جنموں سے بھاری ہے۔ کسی جون میں میری اتنی رسوائی نہیں ہوئی تھی جتنی اس جون میں ہوئی ہے اور یہ جون ہے کہ کھینچتی چلی جا رہی ہے کتنی جلدی جلدی میں نے ایک جون چھوڑی دوسری جون پکڑی مگر اس جون میں آکر پھنس گیا۔ یہ جون تو مجھے شکنجہ بن گئی۔ وہ جسے میرے گلے پہ چھری پھیری ہے پتہ نہیں کہاں مر گیا ہے رام جی کب تک میں اس جنم کو بھوگوں کب تک دنیا والوں کے لئے تماشہ بنا رہوں اور اس کی آنکھیں ساون بھادوں

http://www.pakfunplace.com

کی طرح برس پڑیں۔ کتنی دیر تک چپ چاپ آنسو بہاتا رہا۔ پھر رہا نہ گیا، دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ مداری کی آنکھ کھل گئی۔ بڑبڑانے لگا کہ آج تو بکرا بہت ممیا رہا ہے۔ اٹھ کر اس کے دولاتیں رسید کیں۔

اب صبح ہو رہی تھی۔ مداری نے بکرے کو کھونٹے سے کھولا اور باہر نکلنے کے لئے تیار ہوا۔ بکرے نے چلنے میں چپڑ چپڑ کی تو مداری نے پھر اسے زور سے دولاتیں رسید کیں۔ بیچارا کیا کرتا، سیدھے سبھاؤ چلنے لگا اور جب مداری نے بازار میں پہنچ کر ڈگڈگی بجا کے مجمع اکٹھا کر لیا اور اسے اشارہ کیا تو اس بڑے من بکرے نے بلا کسی اکڑ کے لکڑی کے چار انگل والی تپائی پہ پہلے اگلا کھر ٹکایا، پھر دوسرا اگلا کھر، پھر سہج سے پچھلی دو ٹانگیں اچکا کے چاروں کھر اکٹھے ٹکا لئے۔ تھوڑی دیر تک ڈرتا رہا کہ کہیں ڈگ نہ جائے۔ پھر آخر کو سنبھل گیا۔ آنکھیں موند کے سر نیوڑھایا جیسے تماشائیوں کو پرنام کر رہا ہو۔

وقت

عارف نے ایک لمبی جماہی لی۔ بولا "یار کوئی بات کرو۔"

"کیا بات کریں۔" فاروق نے اکتائے لہجہ میں جواب دیا۔

"کوئی بھی بات۔"

"کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کیا بات کی جائے۔"

پھر چپ۔ مگر عارف چپ بیٹھے بیٹھے بہت بور ہو گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ پھر کچھ ہو۔ یونہی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بڑبڑایا "سالی سگریٹ بھی ختم ہو گئی۔"

"وہ منگائے لیتے ہیں۔" فاروق نے ویٹر کو آواز دی جیب سے پیسے نکالے "یہ لو کیپسٹن لے آؤ۔"

"یار" عارف بولا "ہم پہلے کتنی باتیں کرتے تھے۔"

"ہاں یار۔" فاروق نے اسی اکتائے لہجہ میں مختصر سا جواب دیا اور چپ ہو گیا۔

عارف رک کر بولا "یار تمہیں وہ رات یاد ہے جب باتیں باتیں کرتے کرتے صبح ہو گئی تھی۔"

"وہ تو اکثر ہو جایا کرتی تھی۔"

نہیں، وہ رات جب دلدار آیا ہوا تھا۔ صابر اس رات کتنا رواں تھا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ رات کب اور کیسے گزر گئی۔ چڑیاں بولنے لگی تھیں۔ صابر تھوڑا اونگھا اور پھر آنکھیں مل کر ایسے بیٹھ گیا جیسے پوری نیند لے لی ہو۔ ہمیں ٹھوکا۔ یار سو رہے ہو۔ پھر بولا، ایک

http://www.pakfunplace.com

چائے ہو جائے۔ میں نے باورچی خانے میں جا کر مشکلوں سے ماچس تلاش کی۔ چولہا جلایا۔ چائے بنائی۔ اس کے بعد صابر پھر رواں ہو گیا اور نیند ہماری آنکھوں میں اترتے اترتے جانے کہاں غائب ہو گئی۔"

فاروق کو جیسے سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ اکتاہٹ کی جگہ افسردگی نے لے لی۔ "صابر کے مرنے کے ساتھ بہت کچھ مر گیا۔"

دونوں کو اتنا کچھ یاد آ گیا تھا کہ بالکل ہی چپ ہو گئے۔ ویٹر کیپسٹن لے آیا تھا۔ دونوں نے ایک ایک سگریٹ سلگائی اور خاموشی کے ساتھ پینے لگے۔ الگ الگ ایک ہی یاد میں گم۔

دیر بعد فاروق نے زبان کھولی۔ "دلدار آج کل کہاں ہے۔"

"دوبئی میں ہے اور خوب کما رہا ہے۔"

"ہم سالے یہاں کیوں بند پڑے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی ادھر اُدھر نکل جائیں۔ نہ کمائیں پیسے۔ کملی ہوا ہی سہی۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ اب تو واقعی بہت بوریت ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں پھپھوند رہا ہوں۔"

کہیں سے پرویز آ نکلا۔ شک بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا۔ "کوئی خفیہ بات معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں یار، آؤ بیٹھو۔"

"کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

"باتیں۔ کیسی باتیں۔ بس بیٹھے ہیں اور بور ہو رہے ہیں۔ تمہارے پاس کوئی بات ہو تو کرو۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"کوئی خبر؟"

"سالی کوئی خبر ہی نہیں آئی۔"

"کوئی افواہ؟"

"کمال ہے، ان دنوں کوئی افواہ بھی نہیں ہے۔"

"چھوڑو افواہ اور خبر کو۔" عارف بولا۔ "کوئی سیکنڈل سناؤ۔"

"ان دنوں کوئی سالا سیکنڈل بھی نہیں ہے۔"

"یہ واقعی تشویش کی بات ہے۔"

"کیسے؟"

"یار سیکنڈل ہوتا ہے تو ایک خیال سا ہوتا ہے کہ کچھ ہو رہا ہے۔"

"عارف، تم تو مجھے مریض معلوم ہوتے ہو۔"

"تم نے ایسا غلط نہیں سمجھا۔ مگر میرا مطلب یہ ہے کہ کچھ ہوتے رہنا چاہیئے۔"

"اچھا یار بور مت کرو۔ چائے منگاؤ۔"

عارف نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آ گئی۔ چائے اس کے ساتھ سگریٹ،

"اب کوئی بات ہونی چاہیئے۔" فاروق بولا۔

"بشرطیکہ کوئی بات کرنے کے لئے ہو۔" پرویز نے جواب دیا۔

"یار ابھی ہم یہی بات کر رہے تھے۔" عارف کہنے لگا۔ "پہلے ہم کتنی باتیں کرتے تھے۔ دن دن اور رات رات بھر باتیں کرتے تھے اور سیر نہیں ہوتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ کوئی بات ہی کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ یار ہمیں ہو کیا گیا ہے۔"

پرویز نے مسکراتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔

"یار تم ہنس رہے ہو۔ میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کہ ہمیں ہو کیا گیا ہے۔" تھوڑا رک کر "یا تو باتیں ختم ہو گئی ہیں یا ہم خالی ہو گئے ہیں۔"

"باتیں ختم نہیں ہوا کرتیں۔ بس آدمی خالی ہو جاتا ہے۔" پرویز نے پھر لمبا کش لیا۔

http://www.pakfunplace.com

عارف چپ ہو گیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دھیرے سے بولا "شاید" پھر تھوڑا سوچ کر "ہاں یار، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اب سالی ہم باتیں بھی کرتے ہیں تو (ABSURD) بکتے ہیں"

پرویز پھر تھوڑا مسکرایا "اصل میں ہم (ABSURD) ہو گئے ہیں۔"

فاروق نے تائید میں سر ہلایا "اب تم نے پتہ کی بات کہی ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم (ABSURD) ہو گئے ہیں۔"

"اب تو یار مجھے تمہاری یاسمین بھی (ABSURD) نظر آتی ہے" پرویز نے عارف کی طرف دیکھا۔

"اس کا کہاں سے ذکر نکل آیا۔"

"اصل میں کل میں نے اسے دیکھا تھا"

"اسے؟" عارف چکرایا۔

"یار یہ تو خیر ہے" فاروق کے لہجہ میں ایکدم سے گرمی آ گئی "کہاں دیکھا؟ . . . وہ یہاں ہے۔"

"کمال ہے، پوچھنا تو چاہیئے عارف کو۔ اور پوچھ رہے ہو تم۔"

عارف سٹپٹایا ہوا تھا اور چپ تھا۔

"عارف پوچھنا چاہتا ہے مگر پوچھے گا نہیں۔"

"ہاں کس منہ سے پوچھے۔"

"خیر تو جلدی بتاؤ تم نے اسے کہاں دیکھا۔"

"کل نیشنل آڈیٹوریم میں میوزک کنسرٹ تھا۔ وہاں آئی ہوئی تھی۔ یار وہ تو اب موٹی ہو گئی ہے۔"

"واقعی؟" کہتے کہتے فاروق نے عارف کی طرف دیکھا "سن رہے ہو عارف۔"

"یار تم لوگ کیوں بور کر رہے ہو۔" عارف نے برہمی سے کہا۔

"چلو چھوڑتے ہیں اس کے ذکر کو۔" پرویز نے لاپرواہی سے کہا "ہمیں تو تمہارے واسطے سے اس میں دلچسپی تھی۔ تمہیں اس میں دلچسپی نہیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے اس کا ذکر کرنے کی۔" رکا، پھر بولا "یار عارف، تم بوڑھے ہو گئے ہو۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہارا یہ رویہ یہی بتا رہا ہے۔ ٹھیک ہے کہ اتنے عرصے میں زخم کو مندمل ہو ہی جانا چاہیئے۔ مگر پھر بھی۔"

"یار بور مت کرو۔" عارف نے بیزاری سے کہا "اور کوئی بات کرو۔"

"بات کرنی بھی کیا ضرور ہے۔" پرویز بولا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ بات اگر (ABSURD) ہو تو کرنی کیا ضرور ہے۔"

"مگر مشکل یہ ہے،" فاروق بولا "کہ جب ہم خاموش ہو جاتے ہیں تو ہماری خاموشی بھی (ABSURD) ہوتی ہے۔" رک کر کچھ سوچتے ہوئے "ان دنوں خاموش بھی رہتے تھے تو یہی لگتا تھا کہ کلام ہو رہا ہے۔"

خاموشی۔ مگر کتنے بھنگم طریقہ سے خاموش ہوئے تھے۔ عارف نے ویٹر کو آواز دی۔

"ویٹر، بل لے آؤ۔"

"کیوں جا رہے ہو؟" فاروق نے پوچھا۔

"ہاں یار" بڑبڑایا "آج کی شام بھی برباد گئی۔"

ویٹر بل لے کر آیا۔ عارف نے بل ادا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر ہم بھی چلیں۔" فاروق نے پرویز کی طرف دیکھا۔

"ہاں اور کیا۔" رک کر "یار تم لوگ بہت بور ہو گئے ہو۔"

تینوں اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل آئے۔

"فاروق تم کہاں جا رہے ہو۔" عارف نے پوچھا۔

http://www.pakfunplace.com

"بس یار، اب گھر ہی جاؤں گا۔"

عارف نے پھر پرویز کی طرف دیکھا۔ تھوڑے تامل کے بعد کہا "پرویز تم میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"میرے گھر۔"

"مزید بور کرنا چاہتے ہو۔"

"تمہارے مطلب کی ایک کتاب آئی ہوئی ہے۔"

"کونسی؟"

"چلو اور خود دیکھ لو۔"

پرویز نے تھوڑا سوچا "اچھا چلو چلتے ہیں۔"

عارف نے گھر پہنچ کر اسے وہ سب کتابیں دکھائیں جو اس نے اس مہینے خریدی تھیں۔ ایک کتاب واقعی اس کے مطلب کی تھی "یہ کتاب مجھے پڑھنے کو دے دو!"

"لے لو۔ مگر واپس کردینا۔"

"کبھی میں نے تمہاری کتاب رکھی ہے۔"

"چائے چلے گی؟"

"چل جائے۔"

چائے آگئی۔ کوئی اِدھر کی بات، کوئی اُدھر کی بات۔ کوئی یہاں کی کوئی وہاں کی۔

"یار یہ گھر تمہارا بہتر ہے۔"

"بہت مشکل سے ملا ہے۔ سالے کرائے بہت بڑھ گئے ہیں۔ تم نے اچھا کیا کہ مکان بنا لیا۔"

"لو کہاں بنا لیا۔ بیچ میں رکا ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

"پیسے ختم ہوگئے۔ اب بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ قرضہ ملے تو آگے کام چلے۔ اس مکان نے تو مجھے دو کوڑی کا کر دیا۔"

"یہ تو ہونا تھا۔ یہ مکان سالا گھر کے برتن تک بکوا دیتا ہے۔ بیوی کے زیور ابھی بکے یا نہیں بکے۔"

"نوبت تو آچکی ہے۔ مگر بیوی ابھی رام نہیں ہو رہی۔"

"ہونا پڑے گا۔"

"یار میٹریل بہت مہنگا ہوگیا ہے۔ اینٹ کا بھاؤ پتہ ہے کیا ہوگیا ہے اور سیمنٹ تو مل ہی نہیں رہا۔ عارف یار، کچھ پیسے ہوں تو دو۔"

"پیسے میرے پاس؟ ہم تو سدا کے پھانک ہیں۔ تم پچھلے دنوں اسلام آباد گئے تھے۔ وہاں کچھ بات نہیں بنی۔"

"اسلام آباد میں کوئی پیسے بٹتے ہیں۔ وہ تو میں دوسرے کام سے گیا تھا۔"

"اسلام آباد میں کیا خبریں ہیں۔"

"یار خبریں اگڑ بڑ ہی ہیں۔ مگر کچھ پتہ نہیں سالا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔"

"کسی کروٹ بیٹھے مگر اب بیٹھ جائے۔" رکا، پھر کچھ سوچ کر رازدارانہ سے لہجہ میں بولا "یار سنو۔"

پرویز نے اس کی طرف دیکھا "ہوں۔"

کچھ رکتے ہوئے "یار وہ سچ مچ آئی ہوئی تھی۔"

پرویز ہنسا "تمہارا خیال ہے کہ میں اڑا رہا تھا۔ کل وہ میوزک کنسرٹ میں دیکھی گئی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آئی ہوئی ہے۔"

"کیوں ملنے کا ارادہ ہے۔"

http://www.pakfunplace.com

"نہیں یار" عارف افسردہ ہو گیا۔ چپ رہا۔ پھر بولا "واقعی موٹی ہو گئی ہے؟"

"موٹی بھینس۔"

عارف بے ساختہ ہنسا۔ "نہیں یار۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ بالکل موٹی بھینس ہو گئی ہے۔"

عارف اس مرتبہ زیادہ زور سے ہنسا۔ اپنی ہنسی کو روکا مگر یہ تصور کر کے کہ یاسمین موٹی بھینس ہو گئی ہے پھر کھلکھلا کر ہنسا اور کتنی دیر تک ہنستا رہا۔ ہنسی تھمنے لگتی کہ پھر اسے یاسمین کے موٹی بھینس ہو جانے کا خیال آ جاتا اور پھر ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑتا۔ پرویز بھی ساتھ ہنس رہا تھا۔ مگر عارف کے تو ہنسی سے پیٹ میں بل پڑے جا رہے تھے۔

"یار اس واقعہ پر ایک عاشق کو رونا چاہیئے، تم ہنس رہے ہو۔"

عارف کی ہنسی تھمتے تھمتے پھر زور پکڑ گئی اتنی کہ آنسو نکل آئے۔

"کب سے یہ اتنی ہنسی اکٹھی کر رکھی تھی۔"

عارف ہنستے ہنستے چپ ہو گیا۔ "ہاں یار۔ واقعی" سوچ کر۔ کتنے دنوں بعد، ہم اتنا ہنسے ہیں۔"

تھوڑی دیر عارف بالکل چپ رہا اور پرویز بھی۔ پھر عارف سوچتے ہوئے بولا "یار وہ اس زمانے میں کتنی دبلی ہوا کرتی تھی۔ جیسے ہوا ذرا تیز چلے گی تو بس اڑ ہی جائے گی۔"

"اڑ تو گئی۔"

"ہاں یار اڑ ہی گئی۔" عارف بہت افسردہ ہو گیا۔ تھوڑے تامل کے بعد "ویسے اب کیسی لگتی ہے۔"

"پوری عورت لگتی ہے۔"

"واقعی؟"

"تعجب کر رہے ہو۔ ایک بات مت بھولو۔ مرد اگر مارکھا جائے تو پھر اس کی تکمیل ہو

نہیں پاتی۔ بہت تلافی کے بعد بھی کہیں نہ کہیں کوئی کھانچا رہ جاتا ہے۔ مگر لڑکی کامیاب ہو یا ناکام پوری عورت بن کر مانتی ہے تو میرے دوست اب وہ پوری عورت ہے۔ دو بچوں کی ماں۔ ایک شوہر کی بیوی۔ اب اسے موٹا ہی ہونا ہے۔"

"اس وقت یہ لگتا تھا کہ....."

پرویز نے عارف کی بات کاٹی "اس وقت کی بات چھوڑو۔ اس وقت کو اب وقت کتنا گزر گیا ہے۔ اس کے بارے میں پوچھتے ہو۔ ذرا اپنے آپ کو دیکھو۔"

"ٹھیک کہتے ہو یار۔ وقت بہت گزر گیا ہے۔" عارف نے ٹھنڈا سانس لیا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا "وقت بہت ظالم ہوتا ہے۔"

---

http://www.pakfunplace.com

انتظار

"یار کب آئے گا وہ؟ مجھے تو نیند آنے لگی۔"

"ابھی سے؟ ابھی کونسی آدھی رات ہو گئی۔"

"یار میری عجب عادت ہے۔ ویسے میں رات بھر جاگ لوں۔ لیکن اگر کسی کا انتظار کرنے کو کہا جائے تو پھر میری آنکھوں میں نیند تیرنے لگتی ہے۔"

"فضول آدمی"، کنجی آنکھوں والا لمبو لا "انتظار کے عالم میں تو آئی نیند غائب ہو جاتی ہے تیرا باوا آدم نرالا ہے کہ انتظار میں تجھے نیند آتی ہے۔ جب ہی تو تیرا کوئی عشق کبھی پروان نہیں چڑھا۔"

"بس یار ایسا ہی ہے۔ بری عادت۔ جو ہوئی" فضول آدمی سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

"لمبو، تو بہت چپ بیٹھا ہے۔ کیا تجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

"نہیں یار نیند تو نہیں آ رہی۔ مگر یار انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ آخر کب آئے گا وہ؟"

"بس اب اسے آ جانا چاہیئے۔"

"وقت اس نے بتایا تھا؟"

"میرے حساب سے اب اسے آ جانا چاہیئے۔"

"کنجے، اپنا حساب ہمیں مت بتا۔ یہ بتا کہ اس کی طرف سے تجھے کیا اطلاع ملی ہے۔ کوئی وقت تو بتایا گیا ہوگا۔"

"لمبو جن حالات میں وہ یہاں آ رہا ہے اس میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کہا جائے کہ میں اتنے بج کر اتنے منٹ پر پہنچ جاؤں گا اور ٹھیک اتنے بج کر اتنے منٹ پر پہنچ جائے۔"

"نوجوان تو تو تھک گیا ہوگا؟"

"نہیں۔" بس اس نے مختصر سا جواب دیا اور چپ ہو گیا۔ وہ اپنے انتظار کی کیفیت میں رخنہ نہیں چاہتا تھا۔ اصل میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ انتظار تو وہی کر رہا تھا اس کی خواہش تھی کہ سب چپ رہیں۔ بولیں نہیں بس انتظار کریں۔ سو جب کوئی بولتا تو اسے عجب بیکلی سی ہوتی۔ جتنی بات بڑھتی اتنی اس کی بیکلی بڑھتی جاتی۔ اسے اس وقت کل آتی جب بات کرتے کرتے یار یا لآخر چپ ہو جاتے۔

لمبو نے ایک الکساہٹ کے ساتھ انگڑائی لی "یار بوریت ہو رہی ہے" پھر رک کر بولا "کنجے تاش تو ہوں گے۔ لا نکال۔ دو چار بازیاں ہی ہو جائیں۔ وقت تو کٹے گا۔"

کنجے آدمی معذرت کرنے لگا "یار تاش تو اندر بند ہیں۔"

"تاش بھی اندر بند ہیں۔"

"ہاں یار۔"

"یہ تالا کھل نہیں سکتا؟"

"لمبو تجھے پتہ نہیں ہے کہ چابی اسی کے پاس ہے۔"

"پتہ نہیں وہ کب آئے گا؟"

"میں پوچھتا ہوں کہ وہ آئے گا بھی؟" فضول آدمی پھر بول پڑا۔

نوجوان نے گھور کر فضول آدمی کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

کنجے آدمی نے دلاسا دینے کے لہجہ میں کہا "کیوں نہیں آئے گا۔ اسے بہر حال آنا ہے۔"

"مگر کب؟" لمبو نے سوال کیا۔

"لمبو تھوڑا صبر کر۔ اسے بس اب آ جانا چاہیئے۔"

"ویسے اگر وہ نہ آیا تو؟" فضول آدمی نے پھر ایک سوال اٹھا دیا اور ایسا سوال اٹھایا کہ ایک دفعہ تو سب چکر میں آ گئے۔ سب کو اس خیال نے پریشان کر دیا کہ اگر وہ نہ آیا تو پھر کیا ہوگا

http://www.pakfunplace.com

نوجوان نے تھوڑی برہمی اور بہت اعتماد کے ساتھ اعلان کیا "وہ آئے گا۔"

کنجے آدمی کو اس اعلان سے بہت حوصلہ ہوا۔ اس نے گرمجوشی سے تائید کی "یقیناً آئے گا۔"

لمبو بھی قائل ہو گیا۔ کہنے لگا "اب تو یار اسی پہ سارا دارومدار ہے۔ اسے بہرحال آنا چاہیئے۔"

"یہی میں کہہ رہا ہوں" کنجا آدمی بولا۔

"اور یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ" فضول آدمی پھر بول پڑا "کہ سارا دارومدار اسی پہ ہے وہ اگر نہ آیا تو پھر کیا ہوگا۔"

نوجوان نے شعلہ برساتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ سخت غصے سے بولا "ہمیں CONFUSE کرنے کی کوشش مت کرو۔ وہ آئے گا۔"

کنفیوز ہو جانے کے اندیشہ سے وہ چپ ہو گئے۔ دیر تک چپ رہے۔ آخر لمبو بول پڑا "یار اب تو بہت رات ہو گئی۔"

کنجے آدمی نے ارد گرد نظر ڈالی "یار آج رات بہت کالی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ نہیں آئے گا" مگر لمبو کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ فوراً تصحیح کی "میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت رات میں وہ نہیں آئے گا۔ دیکھتے نہیں ہو رات کتنی کالی ہے۔ پھر یوں بھی اس غیر وقت میں آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"پھر؟"

"میرا خیال یہ ہے کہ اب وہ صبح کو آئے گا۔"

"اچھا؟" کنجا آدمی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"

دونوں نے مل کر ان سارے خطروں کا جائزہ لیا جو رات کے سفر میں مضمر تھے۔ پھر طے کیا کہ وہ اب صبح ہی کو آئے گا۔ نوجوان یہ ماننے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ پر کسی نہ کسی طرح انہوں نے اسے بھی قائل کر ہی لیا۔ پھر طے ہوا کہ اب تھوڑی کمر لگا لی جائے اور ایک نیند لے لی جائے وہ تینوں لیٹ گئے۔ فضول آدمی اسی طرح بیٹھا رہا۔

"فضول آدمی" کنجا آدمی بولا "تجھے تو بہت نیند آ رہی تھی اب کیوں نہیں سوتا۔"

"نہیں"

"کیوں؟"

"مجھے اندیشہ ہے۔"

"اندیشہ؟ کیا اندیشہ؟"

لمبو اسے سمجھاتے ہوئے بولا "میں نے کہا نا کہ رات میں اس کے آنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی امکان نہیں ہے اب وہ صبح ہی کو آئے گا۔"

"اور اگر صبح نہ ہوئی تو؟"

فضول آدمی نے پھر ایسی بات کہہ دی کہ دفعتاً سب چکرا گئے۔ مگر پھر فوراً ہی انہیں احساس ہوا کہ یہ کتنا احمقانہ خیال ہے۔

"یار تو بہت فضول آدمی ہے" کنجا آدمی بولا "بھلا اس خیال کی بھی کوئی تک ہے۔ صبح کیوں نہیں ہوگی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر پتہ نہیں ان راتوں میں مجھے یہ اندیشہ ستاتا رہتا ہے کہ شاید اب صبح نہ ہو۔ ایک رات ہاں پرسوں رات ہی کی تو بات ہے، مجھے لگا کہ رات بہت لمبی ہو گئی ہے۔"

"ہاں پرسوں کی رات تو واقعی بہت بھاری گزری ہے" لمبو نے تائید کی۔

"بس مجھے ایسا لگا کہ اب صبح نہیں ہوگی۔ میں تو بالکل جی چھوڑ بیٹھا تھا۔ وہ تو یہ کہئے کہ اس وقت مرغا بول پڑا۔"

نوجوان نے غصے سے دیکھا۔ "گویا مرغا نہ بولتا تو صبح نہ ہوتی۔"

نوجوان نے تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کی بات کتنی مضحکہ خیز ہے طنزیہ لہجہ میں یہ بات کہی تھی۔ مگر اس نے نوجوان کے طنزیہ لہجہ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ بہت سنجیدہ ہو کر کہنے لگا "ہاں یہ سوچنے کی بات ہے" اور سوچ کر بولا "میرے والد صاحب کہا کرتے تھے کہ ڈکروں میں

http://www.pakfunplace.com

مرغیاں پھڑ پھڑائیں گی اور مرغے بانگ دیں گے اور گائیں کھونٹوں سے بندھی بندھی ڈکرائیں گی اور گھوڑے اپنے تھان پہ کھڑے کھڑے پہلی سے ہنہنائیں گے اور بھاگ نکلیں گے مگر صبح کسی صورت نہیں ہوگی۔"

"یہ کونسی رات ہوگی؟" لمبو کچھ خوفزدہ ہوگیا۔

"یہ دنیا کی آخری رات ہوگی۔" چپ ہوگیا۔ پھر سوچتے ہوئے بولا "صبح ہوگی بھی تو وہ صبح نہیں ہوگی۔ سورج میں روشنی ہی نہیں ہوگی۔ بس جیسے چراغ میں تیل ختم ہوگیا ہو اور بتی کی لو مٹمٹانے کو ہو۔"

کنجے آدمی نے تردیدی لہجہ میں کہا "مگر روایتوں میں یہ ہے کہ اس صبح کو دو سورج نکلیں گے ایک مشرق سے ایک مغرب سے۔"

"دوسرا سورج بھی کام نہیں دے گا۔ وہاں بھی چراغ میں تیل ختم ہو چکا ہوگا۔"

"سب بکواس" نوجوان آخر پھٹ پڑا "میں ان روایتوں کو نہیں مانتا۔ یہ روایتیں گھڑی گئی ہیں اور اسی مقصد سے گھڑی گئی ہیں کہ لوگوں کو ان بحثوں میں الجھا کے اور ایسے اندیشوں میں مبتلا کر کے اصل مسئلہ سے ان کی توجہ ہٹا دی جائے۔ اس فضول آدمی نے بھی یہ بحث اسی وجہ سے چھیڑی ہے کہ اصل مسئلہ سے ہماری توجہ ہٹ جائے۔"

"اصل مسئلہ؟" فضول آدمی نے حیران ہو کر نوجوان کو دیکھا اور معصومیت سے پوچھا "وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ ہے کہ اسے آنا ہے اور پھر ہمیں....." پھر اچانک رک کر بولا "فضول آدمی اگر تمہیں خود پتہ نہیں ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے تو میں تمہیں کیسے سمجھا سکتا ہوں اور اگر تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے تو تم ہمارے ساتھ کس خوشی میں لگے ہوئے ہو۔"

لمبو نے دیکھا کہ نوجوان غصہ میں بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جلدی سے بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولا "نوجوان تجھے تو بہت جلدی غصہ آجاتا ہے۔"

"غصہ۔ غصہ مجھے ابھی کہاں آیا ہے۔ میں تو اپنی طرف سے بہت ضبط کر رہا ہوں۔ مگر کب تک غصہ نہیں آئے گا۔"

کنجے آدمی نے سمجھانے کے انداز میں کہا "نوجوان، تجھے پتہ نہیں کہ یہ کتنا فضول آدمی ہے اس کی بات کو تو ایک کان سننا چاہیئے اور دوسرے کان اڑا دینا چاہیئے۔ اس کا کیا ہے وہ تو نہ خود سوئے گا نہ ہمیں سونے دے گا۔ جلدی ایک نیند لے لو کہ جلدی اٹھ سکو۔"

"نہیں، میں نہیں سوؤں گا۔" نوجوان نے قطعی لہجہ میں اعلان کیا۔

"کیوں؟"

"تم لوگوں کا کیا ہے۔ تم نے تو اپنی طرف سے فیصلہ دے دیا کہ وہ اب صبح کو آئے گا۔ مگر وہ تمہارے فیصلہ کا پابند تو نہیں ہے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتا ہے۔"

کنجا آدمی فوراً ہی قائل ہوگیا "یہ بات بھی ٹھیک ہے کیا پتہ ہے کہ وہ رات ہی میں آنکلے۔ سو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہمیں سونا نہیں چاہیئے۔"

لمبو بھی لیٹے سے اٹھ بیٹھا "اچھا یار نہیں سوتے۔ مگر وقت گزارنے کی کوئی صورت ہونی چاہیئے تاش تو اندر بند ہیں ویسے کیرم سے بھی شغل کیا جا سکتا ہے۔"

"کیرم بورڈ بھی تو اندر ہی بند ہے" کنجے آدمی نے اطلاع دی۔

"یہ تو بڑی بوریت ہے۔"

"کیا کریں یار، کنجی اس کے پاس ہے۔"

"پھر تو واقعی اس کا آنا بہت ضروری ہے۔"

"مگر میں حیران ہوں" کنجا آدمی کہنے لگا "وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔ قاعدے سے اس وقت تک اسے آجانا چاہیئے تھا۔"

"آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ ابھی تک نہ آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔"

http://www.pakfunplace.com

لمبو کچھ جھجکتے ہوئے بولا "کہیں اس کے ساتھ واردات تو نہیں ہو گئی۔"

"نہیں" کنجے آدمی نے اعتماد سے کہا "توبہ کیجیے۔ وہ مار کھا جانے والا آدمی نہیں ہے۔ اور ان چوٹوں سے مار کھا جائے۔ ہرگز نہیں۔"

"پھر کیا وجہ ہوئی۔"

"یار بات یہ ہے" کنجا آدمی سوچتے ہوئے بولا "وہاں سے نکلنا اتنا آسان تو نہیں۔ اسے کوئی داؤں لگا کر ہی نکلنا تھا۔"

"وہ کوفہ سے نکل بھی آئے گا؟" فضول آدمی نے پھر ایک سوال اٹھایا۔

نوجوان نے پھر اسی غصیلی نظروں سے دیکھا "کوفہ میں تو ہم ہیں۔"

لمبو نے تائید میں سر ہلایا "نوجوان نے ٹھیک کہا۔ کوفہ میں تو ہم ہیں" اس کے لہجہ میں کتنی یاس تھی۔

"تو گویا ہم اسے کوفہ میں بلا رہے ہیں۔" فضول آدمی نے زہر خند کیا۔

نوجوان اب کے بس غصیلی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جواب کوئی بن نہ پڑا۔

فضول آدمی نے لمبی جماہی لی "اب میں واقعی سونے لگا ہوں۔" اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور پھر جلدی ہی خراٹے لینے لگا۔

لمبو نے جماہی لی "اس کے خراٹوں سے مجھے بھی نیند آنے لگی۔" لمبو نے کئی مرتبہ آنکھیں بند کیں اور کھولیں۔ پھر سچ مچ بند ہو گئیں۔

"لو وہ بھی سو گیا" کنجے نے کہا۔

نوجوان نے دونوں سوئے ہوؤں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور کنجے سے مخاطب ہوا "دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ لوگ بھلا اس کے ساتھ چل سکیں گے؟"

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔"

"یہ تو کوفی ہیں کوفی۔ پتہ نہیں اس نے کیا سوچ کر ان پر اعتبار کیا ہے۔"

"وہ سب کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

"پھر اس نے ان پر اعتبار کیوں کیا؟"

کنجے آدمی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ رہا۔ نوجوان پھر چپ ہو گیا۔ چپ بیٹھا رہا اور اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ کنجے آدمی کو چپ بیٹھے بیٹھے ایک اونگھ سی آ گئی۔ بس ذرا آنکھ لگی تھی کہ فضول آدمی چونک کر اٹھ بیٹھا "کیا وہ آ گیا؟"

لمبو بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "اچھا۔ آ گیا؟"

کنجے آدمی نے بھی جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور ایسا ظاہر کیا جیسے وہ سو یا ہی نہیں تھا۔

"کوئی نہیں آیا۔" نوجوان نے اطمینان کے ساتھ کہا۔

فضول آدمی نے اپنی بات پر اصرار کیا "میرا خیال ہے کسی نے دستک دی تھی۔"

"مجھے بھی کچھ لگا تو تھا۔" لمبو بولا۔

نوجوان نے دونوں کو بیزاری سے دیکھا "تم دونوں تو سو رہے تھے۔ تمہیں کیسے پتہ کہ کوئی آیا تھا۔ میں جاگ رہا ہوں۔ میں نے دستک کی کوئی آواز نہیں سنی۔ تم نے سنی تھی؟" اس نے کنجے آدمی سے پوچھا۔

"نہیں میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔"

ایک اچھی خاصی بحث چل نکلی کہ وہ آیا تھا یا نہیں آیا تھا۔ فضول آدمی اور لمبو ایک طرف تھے۔ ان کا گمان تھا کہ ان کے سوتے میں کسی نے دستک دی تھی۔

کنجا آدمی ڈھلمل یقین تھا۔ مگر نوجوان قطعی طور پر اس سے انکاری تھا کہ کسی نے دستک دی تھی۔

http://www.pakfunplace.com

"یار یہ تو بالکل الجبل کی دلہنوں والا قصہ ہو گیا" فضول آدمی تاسف بھرے لہجہ میں کہنے لگا۔ "وہ آیا اور ہمیں سوتا پاکر چلا گیا"

"مگر میں جاگ رہا تھا۔" نوجوان نے چلا کر کہا۔

"یار اس میں غصے کی کیا بات ہے۔" لمبو کہنے لگا "بعض اوقات آدمی جاگتے ہوئے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت تم کسی اور خیال میں کھوئے ہوئے ہو۔"

"بالکل غلط۔ سب بکواس ہے۔ میں جاگ رہا تھا اور پورے ہوش میں تھا کوئی نہیں آیا تھا۔ کوئی آہٹ، کوئی دستک نہیں ہوئی۔" اور اس مرتبہ نوجوان نے اتنے قطعی لہجہ میں اور اتنے اعتماد سے اعلان کیا کہ فضول آدمی اور لمبو دونوں چپ ہو گئے اور کبڑے آدمی کو تو بالکل یقین آگیا کہ کوئی دستک نہیں ہوئی تھی۔ اس نے لمبو اور فضول آدمی سے صاف صاف کہہ دیا "یار تمہیں وہم ہوا ہے۔ کوئی دستک نہیں ہوئی تھی اور وہ آتا تو اس طرح واپس تو نہ چلا جاتا۔"

لمبو بولا "خیر اگر وہ نہیں آیا تھا تو اچھا ہی ہوا۔ اگر چلا گیا ہوتا تو پھر مارے گئے تھے۔ اب کم از کم اس کے آنے کی امید تو ہے۔"

"امید۔" فضول آدمی بڑبڑایا۔ پھر دراز ہوتے ہوئے بولا "اچھا تم اپنی امید کا چراغ جلائے بیٹھے رہو میں تو سوتا ہوں۔"

لیٹتے ہی وہ سو گیا۔ خراٹے لینے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھا "دوستو، تم کب سے یاں بیٹھے ہو۔"

"کب سے؟" لمبو بولا "کیوں کیا کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"خواب" فضول آدمی بڑبڑایا "پتہ نہیں، شاید خواب ہی ہو۔" چپ ہوا پھر کھوئی کھوئی آواز میں شروع ہو گیا۔ وہ بالکل میرے سر پہ آکھڑا ہوا اور گرج کر بولا کہ یاں کیوں بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کہ ہم سب اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ تنک و تیز ہو کر بولا۔ کس کے انتظار میں۔ اس پر میں چکرایا۔ کس کے انتظار میں۔ برابر والے سے پوچھا، دوست ہم کس کے انتظار میں یہاں بیٹھے ہیں۔ اس نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا پھر۔۔ میں

نے دوسرے سے پوچھا۔ پھر تیسرے سے پھر ان سب سے پوچھا کہ رفیقو، ہم یہاں کس کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سب نے کہ جن کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں مجھے حیرت سے دیکھا پھر ایک دوسرے کو۔ اور ہم سب ملول ہوئے کہ ہم نے یہاں اس کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اپنی بھویں تک سفید کر لیں۔" وہ چپ ہو گیا اور کسی سوچ میں کھو گیا۔

"فضول آدمی" نوجوان غصے میں بڑبڑایا۔

فضول آدمی جیسے ہوش میں آگیا ہو۔ سنجیدگی سے پوچھا "دیسے ہم یہاں بیٹھے کس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں" نوجوان نے طیش بھری آواز میں کہا "جس کا ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔"

"بالکل ٹھیک ہے" کبڑے آدمی نے کہا۔

"مگر کون ہے وہ؟" فضول آدمی نے اصرار کیا۔

"تمہارا باپ" نوجوان نے گرج کر کہا۔

"مگر میرا باپ تو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"مگر وہ اس دنیا میں ہے وہ آئے گا اور تمہارے مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔"

فضول آدمی چپ ہو گیا۔

نوجوان کبڑے آدمی سے مخاطب ہوا "معلوم ہے ایسے لوگوں کا علاج کیا ہے" ہاتھ کو ایسے چلایا جیسے پستول چلا رہا ہے "گولی" کہا۔ پھر کہنے لگا "وہ جب آئے گا تو ایسے لوگوں کو بخشے گا نہیں۔"

فضول آدمی نوجوان کو تکنے لگا۔ پھر بولا "اتنا انتظار کرا کے آنے والے اتنے ظالم کیوں بن جاتے ہیں"

"ظالم؟ کیا مطلب؟" لمبو نے چکرا کر پوچھا۔

http://www.pakfunplace.com

"یہی کہ نجات دلانے آتے ہیں اور پھر ان سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

نوجوان نے معنی خیز نظروں سے گنجے آدمی کو دیکھا۔ آہستہ سے کہا۔ "میں نے کیا کہا تھا۔ وہ بات ٹھیک نکلی نا۔"

گنجے آدمی نے فضول آدمی کو شک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔"

لمبو کا ماتھا ٹھنکا "کیا کہہ رہا تھا نوجوان"

"کچھ نہیں۔" گنجے آدمی نے مختصر جواب دیا۔

لمبو نے ایک شک کے ساتھ نوجوان اور گنجے کو دیکھا۔ اور چپ ہو گیا۔ ایک وسوسہ اسے ستانے لگا تھا کہ جانے ان دونوں نے اس کے سوتے میں کیا باتیں کی ہیں۔ طرح طرح کی باتیں اس کے دھیان میں آئیں اور ہر بات ایسی کہ اس کے ساتھ طرح طرح کے اندیشے اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ پھر اس نے ایک دم سے سارے وسوسوں سارے اندیشوں کو رد کر دیا۔ سوچ کر کہ اس جال میں پھنس گیا تو پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا، باقی جو صورت جس وقت پیش آئے گی اس وقت سمجھ لیں گے۔ دھیان کو اس طرف سے ہٹانے کی خاطر اس نے ایک مرتبہ تاشوں کی بات چھیڑ دی۔ مقفل دروازے کو غور سے دیکھا اور بولا "اگر تالا کھل جاتا تو تاش ہی کی کچھ بازیاں ہو جاتیں۔"

"اب وہ آ ہی جائے گا۔" گنجا آدمی بولا "پھر جتنی چاہے بازیاں کھیلنا۔"

"لو بھلا اس کے آنے کے بعد تاش کھیلیں گے۔ اس وقت اتنی فرصت کہاں ہو گی فرصت تو اب ہے۔"

نوجوان نے تلخ لہجہ میں کہا "ہاں جب تک وہ نہیں آتا ہے یاروں کے لئے فرصت ہی فرصت ہے۔ تاش کھیلیں، کیرم کھیلیں، جو فضولیات کرنا چاہتے ہیں کریں۔ میں دیکھوں گا کہ اس کے آنے کے بعد کوئی کیسے ان بے معنی سرگرمیوں میں وقت ضائع کرتا ہے۔"

فضول آدمی پریشان ہو کر بولا "گویا اس کے آنے کے بعد مجھے فلیش کھیلنے کی آزادی

نہیں ہو گی۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بے عملی کے زمانے کے مشغلے ہیں۔ وہ عمل کا وقت ہو گا۔"

"مگر وہ آئے بھی تو سہی۔" لمبو بولا

"آئے گا۔" نوجوان نے یقین کے ساتھ کہا

"مگر کب؟"

"جلدی۔ بہت جلدی۔"

"اتنی رات ہو گئی۔ اب کیا آئے گا۔" تامل کیا پھر بولا "میرے خیال میں اب وہ صبح ہی کو آئے گا۔"

"صبح۔ صبح۔ صبح۔" فضول آدمی جھنجھلا گیا "لمبو تیرے اعصاب پہ صبح کیوں سوار ہو گئی ہے۔"

"صبح نہیں، اصل میں یہ لمبی رات میرے اعصاب پہ سوار ہے۔ پتہ نہیں کب اس کا انت ہو گا ..... کب صبح ہو گی۔ . . . . کب وہ آئے گا۔"

"صحیح کہا ہے کہنے والوں نے کہ لمبا آدمی احمق ہوتا ہے۔ لمبو تجھے پتہ نہیں ہے کہ ایسی راتوں کی صبح کیسی ہوتی ہے۔"

"یار یہ بکواس بند کرو" گنجا آدمی چڑ کر بولا۔ "اگر کسی کے پاس سگریٹ ہے تو وہ نکالے۔"

فضول آدمی نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا "لو سگریٹ کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔" جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکالی۔

لمبو نے سگریٹ لیتے ہوئے کہا "فضول آدمی، تو تو بہت کام کا آدمی نکلا۔ اگر سگریٹ نہ ہوتی تو ہم بالکل ہی مارے گئے تھے۔"

تینوں نے ایک ایک سگریٹ لگا لیا۔ پھر فضول آدمی نے ڈبیا نوجوان کی طرف بڑھائی

http://www.pakfunplace.com

جو ابھی تک اسی طرح تنا بیٹھا تھا "نوجوان سگریٹ پی۔"

"نہیں"

"اچھا مت پی۔ ویسے تیرے سگریٹ نہ پینے سے وہ جلدی تو نہیں آجائے گا۔ آنا تو اسے اپنے وقت ہی پہ ہے، اگر اسے آنا ہے۔"

"تجھے اس میں کچھ شک ہے۔"

"شک..... نہیں کچھ زیادہ نہیں۔ کیا پتہ ہے وہ آ ہی جائے۔"

نوجوان کا پارہ پھر چڑھنے لگا تھا لیکن لمبو نے دوسرا ہی قصہ چھیڑ دیا۔ سگریٹ کے کش کے ساتھ اس میں کچھ گرمی آ گئی تھی۔ کہنے لگا "یار جاگنے کا پرانا سسٹم اچھا تھا۔ الاؤ روشن کیا۔ ادھر گرد بیٹھے اور کوئی کہانی شروع کر دی۔ داستان والے ذرا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ سو ان کے تجگے زیادہ زوردار ہوتے تھے۔" پھر ایک حسرت کے ساتھ کہنے لگا "یار ہمارے درمیان کوئی داستان گو ہونا چاہیئے تھا۔"

نوجوان نے زہریلی نظروں سے اسے دیکھا۔ بولا "لمبو اس کے بعد تو کہے گا کہ افیون گھولنے کے لئے کوئی چاندی کی کٹوری بھی ہونی چاہیئے۔"

فضول آدمی نے نوجوان کی طنز کو بالکل فراموش ہی کر دیا۔ افیون اور چاندی کی کٹوری کے ذکر پر اس کی تو باچھیں کھل گئیں "یار۔ پھر تو لطف آ جاتا۔ ویسے میں نے یہ نشہ کیا کبھی نہیں ہے۔ سالی ہماری قسمت میں تو وہسکی رہ گئی ہے۔ چاندی کی کٹوری میں گھل کر افیون کیا قیامت ڈھاتی ہوگی، بس اس کا تو میں تصور ہی کر سکتا ہوں۔"

"فضول آدمی" نوجوان غصے سے بڑبڑایا "آخر DECADENCE کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

لمبو نے نوجوان کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ لمبا کش لیا اور بولا "یار اگر اس وقت وہسکی ہوتی تو مزہ آ جاتا۔"

"ہاں پھر یہ بوریت تو نہ ہوتی" گنجا آدمی بولا "کیا کریں یار۔ سالا تالا بند ہے اور چابی

اس کے پاس ہے۔"

"کیا؟" لمبو چونک پڑا "وہسکی ہے"

"ہاں یار ہے تو صحیح۔ پوری بوتل۔ مگر سالی چابی ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"یار، تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"پہلے بتا دیتا تو کیا ہوتا۔"

"خیر اب تو اُسے آ ہی جانا چاہیئے۔ بس ابھی آ جائے تو مزہ آ جائے۔ پورا جشن منائیں گے۔"

"یار" فضول آدمی کے اندر شک کی ایک لہر اچانک اُٹھی "وہ ہم سے دغا تو نہیں کرے گا۔"

"دغا؟" گنجے نے اسے گھور کر دیکھا "وہ ہم سے دغا کرے گا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

نوجوان نے اپنے زہر بھرے لہجے میں ٹکڑا لگایا "البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے ہمارے بارے میں شک ہو کہ کہیں ہم اس سے دغا نہ کریں۔"

"یعنی ہم؟" لمبو نے ہم پر کتنا زور دیا تھا۔

"مطلب یہی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔"

"کوئی کون ہو سکتا ہے۔" فضول آدمی جیسے وضاحت طلب کر رہا ہو۔

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ آدمی کو کوئی ہوتے دیر تھوڑا ہی لگتی ہے۔ میں ہو سکتا ہوں۔ تم ہو سکتے ہو۔"

"کیا کہا۔ میں؟"

"ہاں تم۔" نوجوان نے فضول آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ایک دم سے وہ پھر طیش میں آ گیا تھا مگر اس مرتبہ فضول آدمی کو بھی تاؤ آ گیا۔ منہ غصے سے لال ہو گیا۔ "گالی میں برداشت نہیں کر سکتا"، اور فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا جیسے نوجوان سے دو دو ہاتھ کرنے پہ آمادہ ہو۔ نوجوان نے بھی آستینیں چڑھا لیں۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ گنجا آدمی اور لمبو دونوں انہیں خاموش دیکھا کئے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ وہ تو سچ مچ کٹ مرنے پہ تل گئے

http://www.pakfunplace.com

ہیں تو انہوں نے اٹھ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لمبو نے فضول آدمی کو تھاما۔ کنجے آدمی نے نوجوان کو جیسے تیسے سنبھالا۔ وہ تو بس فضول آدمی پہ ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا۔ تو تھمبو کر کے دونوں کو الگ الگ بٹھایا کچھ جھڑکایا کچھ سمجھایا۔ "اس نازک وقت میں تمہیں لڑنے کی سوجھی ہے۔ حد ہو گئی۔"

نوجوان یوں چپ تو ہو گیا۔ مگر اس کی آنکھوں میں اس کے بعد دیر تک خون ابلتا رہا۔ فضول آدمی کے سر پہ چڑھا بھوت جلد ہی اتر گیا۔ غصہ جس تیزی سے چڑھا تھا اسی تیزی سے اترا۔ پھر وہ الگ گم سم بیٹھ گیا۔ کنجا آدمی اور لمبو بھی چپ رہے۔ چپ رہنے ہی میں انہیں عافیت نظر آ رہی تھی۔ وہ بولیں تو پتہ نہیں کہ کس بات سے کیا بات نکلے اور وہ دونوں رفیق پھر بھڑک اٹھیں۔

دیر بعد لمبو بڑبڑایا۔ "ہم کس مشکل میں پھنس گئے ہیں۔"

کنجا آدمی اپنی بلی جیسی آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔ پھر بولا۔ "یار آدمی پھنستا جلدی ہے۔ نکلتا دیر سے ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ ایک دفعہ آدمی پھنس جائے پھر اسے اللہ ہی نکالے تو نکالے۔ اس پہ مجھے حضرت موسیٰ کے حواریوں کا قصہ یاد آ گیا۔ یہ لوگ چلتے چلتے ایک صحرا میں جا نکلے۔ وہاں ایسے پھنسے کہ چالیس برس تک اسی صحرا میں بھٹکتے رہے۔ نکلنے کا راستہ انہیں نہیں مل پاتا تھا۔"

"چالیس برس تک"، نوجوان نے حیرت سے سوال کیا۔

"جی چالیس برس تک"

"ان لوگوں کا ہمت کا احساس بہت کمزور تھا۔"

"خیر وہ تو صحرا تھا۔" لمبو کہنے لگا۔ "صحراؤں میں تو یوں بھی سمتوں کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور پھر وہ زمانہ۔ میں تمہیں اپنا اس زمانے کا تجربہ سناتا ہوں۔ ایسا ہوا کہ مجھے گلبرگ ایک عزیز کے یہاں جانا تھا۔ سدا سے ایسی زیادہ نہیں گئی تھی۔ اول شب سمجھو۔ ہاں بارش ہو رہی تھی۔ اور بارش کی راتوں میں تم نے دیکھا ہو گا کہ سٹریٹ لائٹس کے باوجود رستے آپس میں کچھ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ سو دفعہ کا وہ گھر دیکھا ہوا، وہ سٹریٹ دیکھی ہوئی۔ مگر کہیں قریب ہی

جا کر میں بھٹک گیا اور غلط گلی میں مڑ گیا۔ بس پھر میں ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ وہ گلی نہ ملے جس میں وہ گھر تھا۔ بس آس پاس کی گلیوں میں گھنٹوں بھٹکتا رہا۔ بالآخر ایک ریستوراں میں جا کر میں نے انہیں فون کیا اور وہ خود آ کر مجھے لے گئے۔ تو بھائی آدمی کا قدم ایک مرتبہ بہک جائے۔ بس پھر سمجھ لو کہ گیا کام سے۔"

نوجوان سوچ میں پڑ گیا۔ کنجا آدمی کنجی آنکھوں سے اسے تکتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ فضول آدمی بول پڑا۔ کہنے لگا "یار کبھی تو وہ اتنا قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے قدموں کی آہٹ سن سکتا ہوں۔ لگتا ہے کہ یہیں اس پاس کی گلیوں میں منڈلا رہا ہے۔ بلکہ اس گھر کی دہلیز کے قریب۔ اور کبھی یوں لگتا ہے کہ دور صحراؤں میں بھٹک رہا ہے۔ اور یہ کہ وہ ہم تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"بکواس"، نوجوان نے غصے سے ہونٹ چبائے۔

اس نے نوجوان کے ردِ عمل کو یکسر نظر انداز کیا۔ سرک کر لمبو کے قریب آ گیا۔ رازدارانہ لہجہ میں بولا "مجھے لگتا ہے کہ اس وقت وہ کہیں آس پاس ہے۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے۔ اسے آنا چاہیئے۔"

"میرا خیال"، لمبو نے فضول آدمی کو گھور کے دیکھا "ہم اسی آس پہ تو بیٹھے ہیں کہ وہ آئے اور ہم اس مشکل سے نکلیں۔"

"لیکن اگر اس کے آنے کے بعد بھی ہم اس مشکل سے نہ نکل سکے تو؟"

لمبو چکرا گیا۔ نوجوان حسبِ عادت پھر غصے سے کانپنے لگا۔ کنجا آدمی بہت بے مزہ ہوا "یار کس فضول آدمی کے ساتھ پالا پڑ گیا ہے۔"

"تو کیا چاہتا ہے"، لمبو نے اس سے سیدھا سوال کیا "اسے نہیں آنا چاہیئے؟"

"یہ تو میں نہیں کہوں گا۔ اسے آنا تو چاہیئے۔" رک کر بولا "تم لوگوں کو پتہ ہے کہ اب کے میں نے عریضہ ڈالا تھا۔"

نوجوان چکرایا "عریضہ؟ کیسا عریضہ۔"

http://www.pakistanplace.com

نوجوان: "یہ ہم لوگوں کی رسم ہے۔ ہر شب برات پر امام منتظر کے نام عریضے ارسال کرتے ہیں"

نوجوان ہنسا۔ "دنیا میں کیسے کیسے توہم پرست لوگ ہیں۔"

بلمو نے بہت میانہ روی برتی۔ نوجوان کو ٹوکا۔ "نوجوان یہ عقیدے کا مسئلہ ہے کسی کو کسی کے عقیدے کی تضحیک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

نوجوان نے ایک تحقیر کے ساتھ ہوں کہا اور چپ ہوگیا۔

وہ پھر شروع ہوگیا۔ "میں نے پہلے کبھی عریضہ نہیں ڈالا تھا گھر کے سب لوگ ڈالا کرتے تھے۔ میں اس کا قائل ہی نہیں تھا۔ مگر اس برس شب برات پر میں نے آخر شب اٹھ کر وضو کیا۔ پیالی میں زعفران گھولا۔ بہت عقیدت کے ساتھ عریضہ میں اپنی یہ تمنا رقم کی۔ اسے میدے میں لپیٹ کر تاروں کی چھاؤں میں دریا کنارے پہنچا اور اپنے عریضے کو لہروں کے سپرد کر دیا اس توقع کے ساتھ کہ کوئی نیک پاک مچھلی میرے اس عریضے کو امام غائب کے حضور لے جائے گی۔"

"اچھا کیا" بلمو نے اسی میانہ روی کے ساتھ کہا

"مگر اب مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"ڈر؟ ... کیسا ڈر؟"

فضول آدمی بلمو کے اور قریب سرک آیا اور ایسے بولا جیسے اس کے کان میں بات کر رہا ہو اور ایک تشویش کے ساتھ "یہی کہ کہیں وہ آ ہی نہ جائے۔"

پلیٹ فارم

دیر بعد ایک اکتاہٹ کے ساتھ اس نے کتاب بند کی، تھکی آنکھوں پہ انگلیاں پھیریں اور اردگرد ایک نظر ڈالی۔ وہ سب اب ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ بستروں، بکسوں، گٹھڑیوں پوٹلیوں کے بیچ کوئی پھنسا ہوا، کوئی ان پہ چڑھا ہوا سب تھکے تھکے، چپ چپ۔ بس یوں ہی کسی سفید وردی والے کو گزرتے دیکھ کر کسی کا پوچھ بیٹھنا۔ "بابو صاحب گاڑی کی کوئی خبر؟"

"ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے۔"

"کوئی امید ہے؟"

"کہا نہیں جا سکتا۔"

اور اس کے گزر جانے کے بعد فاصلہ پر بیٹھے ہوئے کسی مسافر کا اسی طرح بستر سے پیٹھ لگائے لگائے سوال کرنا "ریل بابو کیا کہتا ہے۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ ریل کی کوئی خیر خبر۔ کہتا ہے کہ کوئی نہیں"

پھر خاموشی کا چھا جانا اور بادامی بشرٹ والا تو بالکل ہی گم سم بیٹھا تھا۔ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر اسے زیادہ تعجب ہوا۔ سب سے زیادہ شور تو اسی نے مچایا تھا۔ یوں تو سب یہ خبر سن کر بوکھلا اٹھے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس وقت کا پورا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔

"کیا کہا۔ گاڑی نہیں جائے گی؟"

"نہیں۔"

"یعنی آج گاڑی جائے گی ہی نہیں۔"

http://www.pakfunplace.com

"نہیں"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"صاحب جو ہمارے پاس اطلاع تھی وہ ہم نے آپ کو دے دی"

آس پاس کھڑے مسافر حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"کمال ہے صاحب، گاڑی کا لیٹ ہونا تو سنا تھا۔ مگر گاڑی کی روانگی کا پروگرام ہی منسوخ ہو جائے۔ یہ آج ہم پہلی مرتبہ سن رہے ہیں۔"

مسافر پہلے کچھ حیران کچھ پریشان ہوئے۔ پھر ایک دم سے مسافروں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ایک دم سے ان میزوں کے گرد جہاں پاسپورٹوں پہ اندراجات ہوا کرتے تھے اور سامان چیک کیا جاتا تھا۔ ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ پاسپورٹوں پر اندراجات کرنے والے اور سامان چیک کرنے والے سب اپنی اپنی سیٹ پر موجود تھے مگر ان میں سے کوئی کسی پاسپورٹ پر اندراج کرنے کے لئے اور کسی مسافر کا سامان چیک کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

بادامی بشرٹ والا مسافر مجمع کو چیر کر تیزی سے میز کے قریب پہنچا۔ غصے سے بولا "مسٹر میرے ویزا کی میعاد آج ختم ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں"

"آپ کچھ نہیں کر سکتے تو اور کون کر سکتا ہے۔"

"انہیں چھوڑیئے کسی ذمہ دار افسر سے بات کرنی چاہیئے۔" ایک مسافر نے تجویز پیش کی۔

"سٹیشن ماسٹر کہاں ہے۔" بادامی بشرٹ والے نے اسی غصے کے لہجہ میں سوال کیا۔

پاسپورٹوں پر اندراج کرنے والے کلرک نے سامنے کمرے کی طرف اشارہ کیا "ادھر جائیے اور ان سے بات کر لیجئے۔"

پورا مجمع بادامی بشرٹ والے کی قیادت میں چلا اور اس کمرے پہ امنڈ پڑا۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ اندر داخل ہو کر خود بات کرے اور بتائے کہ اس کے ویزا کی میعاد آج

ختم ہو رہی ہے۔

مسافروں کی ایک نئی ٹولی سامان سے لدے پھندے قلیوں کے جلو میں آہنی دروازے پر کھڑے پہریدار کو پاسپورٹ دکھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ یہ سب مسافر کتنی عجلت میں تھے اور کتنے فکر مند کہ ان کے حساب سے گاڑی کی روانگی میں بس اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ لپک جھپک اندراج کرنے والے کے کاؤنٹر پہ پہنچے اور اپنے اپنے پاسپورٹ میز پہ پھیلا دیئے۔ مگر پہلے وہ اس پہ حیران ہوئے کہ میز خالی ہے جیسے جھاڑ دی ہوئی ہو اور کلرک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ پھر اس پہ حیران ہوئے کہ ان کلرکوں نے ان کے پاسپورٹ قبول کرنے اور ان پر اندراج کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلے حیران ہوئے۔ پھر برہم ہوئے "بھی کیا کہا۔ آج گاڑی نہیں جائے گی؟"

"نہیں۔"

"یعنی کہ آج ٹرین چلے ہی گی نہیں۔"

"نہیں۔"

علی گڑھ کٹ پائجامہ اور شیروانی میں ملبوس ایک معزز شخص نے یہ ساری گفتگو تحمل سے سنی۔ اس کے پیچھے کھڑا ہوا وہ نوجوان جس کی مسیں بھیگ چلی تھیں اور جس نے چست نیلا تہلون اور چار خانے والی قمیص پہن رکھی تھی۔ آگے بڑھ کر کچھ کہنے لگا تھا کہ اس معزز شخص نے اسے روکا۔ چھڑی ہلاتا خود آگے بڑھا۔ "میرے عزیز، تم لوگ ہم ادھر سے آنے والوں کے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ بہت افسوس کی بات ہے۔"

"باشاؤ، ہم نے آپ سے کوئی مذاق نہیں کیا۔ آپ کو بتایا ہے کہ آج ٹرین نہیں جائے گی۔"

"کیسے نہیں جائے گی۔ آپ کو کچھ احساس ہے کہ یہ جتنے مسافر یہاں جمع ہیں وہ اپنے قیام کی مدت پوری کر چکے ہیں۔ مثلاً میرا ویزا آج ختم ہو رہا ہے۔ مجھے بہر صورت آج سرحد

http://www.pakfunplace.com

کو عبور کر جانا چاہیئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی، پر ٹرین آج نہیں جائے گی۔ اُدھر سے آئی ہی نہیں ہے جائے گی کیسے؟"

"تو یہ کہئے کہ ٹرین لیٹ ہے۔"

اسی آن بادامی بشرٹ والا غصے میں بھرا اس سے بڑے مجمع کے ساتھ جس کی معیت میں گیا تھا واپس آن پہنچا۔ "صاحب یہاں کے افسر تو بالکل فرعون بے سامان ہیں۔ دوسرے کی نہیں سنتے۔ اپنی کہے جاتے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں۔"

"وہی ایک رٹ کہ ٹرین آج نہیں جائے گی۔"

"معاف کیجئے آپ کے پاس ماچس ہو گی۔" بنچ پر اس کے قریب بیٹھا ہوا شخص جو دیر سے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا اس سے مخاطب ہوا۔

اس نے اپنے تصور کو برطرف کر کے جیب سے ماچس نکال اخبار پڑھنے والے شخص کو پیش کی۔ اخبار بین نے سگریٹ سلگائی اور شکریے کے ساتھ اسے ماچس واپس کر دی۔ اس کے ساتھ اسے خود بھی سگریٹ پینے کا خیال آ گیا۔ جیب سے پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی۔ پھر جہاں سے کتاب چھوڑی تھی وہاں سے اسے کھولا۔ اور اسی کے ساتھ اس نے اِدھر اُدھر ایک نظر ڈالی۔ اب وہ سب کہ اس وقت اتنے آگ بگولا تھے اور اتنا شور مچا رہے تھے ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ بادامی بشرٹ والے نے بستر سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ کتنی دیر سے وہ چپ تھا اور اونگھ رہا تھا۔ اس کی بشرٹ اب ملی دلی نظر آ رہی تھی اور بادامی سے مٹیالی ہو چکی تھی۔ شیروانی والا معزز شخص بستر بند میں لپٹے بستر پہ ٹکا ہوا تھا۔ ٹھوڑی اپنی خوبصورت چھڑی کی مٹھ پر ٹکا رکھی تھی اور مٹھ کو دونوں ہاتھوں سے جینچا ہوا تھا۔ کتنے مسافر کسی تکلف میں پڑے بغیر چادریں بچھا کر فرش پر پسر گئے تھے تو لوگ گرما گرما کر اتنی جلدی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، اور اتنی جلدی ہم حالات سے ... مگر خیال کی اٹھتی ہوئی لہر اٹھتے اٹھتے بکھر گئی کہ

اسی آن کچھ نئے مسافر سامان سے لدے پھندے قلیوں کی ہمراہی میں یہاں آ پہنچے تھے اور گاڑی کی معطلی کی خبر پر حیران و پریشان تھے۔ شاید کراچی سے کوئی گاڑی آئی ہے۔ اس نے سوچا۔ کراچی کی ہر گاڑی کے بعد کچھ بھولے بھٹکے حالات سے بے خبر مسافر یہاں بس اسی طرح آن ٹپکتے۔ یہ سن کر کہ گاڑی نہیں جائے گی پریشان ہوتے، بھاگ دوڑ کرتے، کسٹم والوں کو پکڑ پکڑ کے سوال کرتے، گرم و سرد ہوتے اور پھر تھک ہار کر اس تھکے ہوئے مجمع کے بیچ کسی نہ کسی طور جگہ بنا کر پسر جاتے اور بالکل ان جیسے بن جاتے۔

مسافروں کی یہ نئی کھیپ بھی تھوڑا تڑپ پھڑک کر ڈھیے ہوتے مسافروں میں کھپ چلی تھی اور اس نے نئی سگریٹ سلگا کر ایک گونہ یکسوئی کے ساتھ کتاب پھر پڑھنی شروع کر دی تھی کہ ایک اکیلا مسافر سگریٹ منہ میں دبائے خالی ایک سوٹ کیس قلی کے سر پہ دھرائے جلدی جلدی قدم اٹھاتا نمودار ہوا۔ پسرے ہوئے مسافروں کو پریشان نظروں سے دیکھا۔ "یہاں تو ٹرین کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔"

"بابو جی، میں نے تو پہلے ہی آپ کو بتا دیا تھا۔" قلی بولا۔

"اچھا سوٹ کیس یہاں رکھ دو۔"

قلی کی رخصتی کے بعد سوٹ کیس والا مسافر تھوڑی دیر جھجک میں رہا۔ مگر جلدی ہی وہاں سے گزرتے ہوئے ایک سفید وردی والے سے اُلجھ گیا۔ "معاف کیجئے، آپ ٹرین کے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں۔"

"ابھی ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں آئی۔"

"معاف کیجئے، میں نے کراچی سے چلتے وقت آپ کے محکمہ سے انکوائری کی تھی۔ وہاں سے مجھے اطلاع ملی کہ ٹرین آج چلے گی۔"

"آپ کو غلط اطلاع ملی۔"

سوٹ کیس والے کو اس پر تھوڑا غصہ آ گیا۔ "دیکھئے کل میرا دلی میں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔"

http://www.pakfunplace.com

اگر مجھے کراچی میں یہ پتہ چل جاتا تو میں روٹ بدلوا لیتا اور ہوائی جہاز سے چلا جاتا۔ میں اگر کل دہلی نہیں پہنچتا تو آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ میرا کتنا نقصان ہو جائے گا۔ میں آپ لوگوں پر ہرجانہ کا دعوے کر سکتا ہوں۔"

"ہرجانے کا دعوے؟" ریلوے افسر نے سوٹ کیس والے کو سر سے پیر تک دیکھا، تعجب اور تحقیر سے۔ اور پھر وہ آگے چلا گیا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا۔" دور بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے جس نے قمیص اتار کر الگ رکھ دی تھی اور خالی بنیان میں اینڈ رہا تھا۔ شاباشی کے لہجہ میں کہا "یہ لوگ اسی طرح ٹھیک ہوں گے ورنہ وہ تو کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔"

سوٹ کیس والا اس گفتگو سے فارغ ہو کر پھر چکنم میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر اپنے سوٹ کیس پر بیٹھتے ہوئے شیروانی والے معزز شخص سے مخاطب ہوا "معاف کیجئے آپ تو ادھر سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی۔"

"آپ بھی یہاں آج ہی پہنچے ہیں۔"

"نہیں میرے بھائی۔ ہم تو اول دن سے مبتلائے الم چلے آ رہے ہیں"

"کمال ہے" سوٹ کیس والا متعجب ہو کر چپ ہو گیا۔ مگر پھر فوراً ہی سامنے بنچ پر بیٹھے ہوئے اخبار بین مسافر سے مخاطب ہوا "آپ بھی اسی دن یہاں آ گئے تھے۔"

"نہیں، میں تو لاہور ہی میں رہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آج ٹرین چلے گی۔ سوچا کہ بہت رش ہوگا جلدی پہنچ لو تو میں یہاں منہ اندھیرے پہنچ گیا تھا۔ اس وقت سے یہ وقت آ گیا۔ ٹرین کا کوئی اتا پتہ نہیں ہے۔"

اب سوٹ کیس والے کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک تعجب کے ساتھ کہ ایسے پریشانی کے وقت میں وہ کس اطمینان سے کتاب پڑھ رہا ہے۔

"پروفیسر صاحب، آپ یہاں کب سے آئے بیٹھے ہیں۔"

اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر سوٹ کیس والے کو دیکھا۔ بولا "ازل سے" اور پھر کتاب پر جھک گیا۔ مگر پھر ایک دفعہ اس نے سر اٹھایا "ویسے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں کسی کالج کا معلم نہیں ہوں۔"

اس جواب پر سوٹ کیس والا کچھ سٹپٹا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کتاب والے نے اس سے کیا کہا اور اسے اب کیا کہنا چاہیے۔ اس کے بعد اسے کسی اور مسافر سے پوچھنے گچھنے کا حوصلہ نہیں پڑا۔ بس چپ ہی تو ہو گیا۔

اس نے کتاب پڑھتے پڑھتے ایک اچٹتی سی نظر سوٹ کیس والے پر ڈالی کہ اب بالکل چپ بیٹھا تھا اور اسے لگا کہ اس شخص کی بھی گرمی اب نکل چلی ہے کہ بس ڈھیلے لگا ہے۔ مسافروں کے ڈھیر میں تھوڑا اور اضافہ۔ مگر اسی آن اس طرف سے سٹیشن ماسٹر گزرا۔ بس سوٹ کیس والے میں پھر سے توانائی آ گئی۔ "جناب، ٹرین کے متعلق کوئی اطلاع؟"

"ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ہے۔"

"آپ کو کچھ اندازہ تو ہوگا کہ ٹرین کب چلے گی؟"

"جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"حالات کب ٹھیک ہوں گے؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ حالات جب بگڑ جائیں تو جلدی تو ٹھیک نہیں ہوا کرتے۔"

"بلکہ پھر ٹھیک ہوا ہی نہیں کرتے" اس نے کتاب کا ورق الٹتے الٹتے ٹکڑا لگایا۔

"کیا مطلب؟" سوٹ کیس والے نے چڑ کر سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ حالات اگر ایک مرتبہ بگڑ جائیں تو پھر ٹھیک نہیں ہوا کرتے۔"

اخبار بین مسافر بھی آخر چڑ گیا "یہ کوئی کلیہ ہے۔"

"کلیہ تو نہیں، مشاہدہ ہے اور معاف کیجئے اس معاملہ میں تو ہم سے زیادہ آپ کا مشاہدہ

http://www.pakfunplace.com

ہونا چاہیئے۔"

"دیکھئے پروفیسر صاحب بات یہ ہے۔ ....." جانے اخبار بین مسافر کیا کہنے لگا تھا۔ اس نے بات ہی بیچ میں سے کاٹ دی "دیکھئے جناب میں ایک مرتبہ وضاحت کر چکا ہوں کہ میں پروفیسر نہیں ہوں۔ اب آپ مجھے پروفیسر کہیں گے تو اپنے فعل کے خود ذمہ دار ہوں گے۔"

اپنی بات کٹ جانے کے بعد اخبار بین مسافر چپ ہی ہو گیا۔ اس نے پھر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی رہی۔ یہ خاموشی اس وقت ٹوٹی جب پاندان والی بوا نے اپنا پاندان کھولا اور چونک کر بڑبڑائیں "اے ہے میرے تو ڈوبے پان بھی ختم ہو گئے۔"

برابر میں بیٹھی ہوئی بی بی کب سے برقعہ آدھا اوڑھے آدھا اتارے ہاتھ میں کھجوری پنکھا لئے جھل رہی تھی۔ بولی "بوا مجھے تو ایک کتر دے دو۔ نگوڑا منہ تو چلے۔"

پاندان والی بوا نے پان کا ایک ٹکڑا اپنے لئے ایک پنکھے والی کے لئے لگایا۔ اسے دیتے ہوئے کہنے لگی "بی بی بس یہ آخری کتر ہے۔"

"مگر بوا، تمہیں تو مجھ سے بھی آگے جانا ہے۔ پان تو تمہیں خریدنے ہی پڑیں گے۔ تم تو سرسی جاؤ گی نا؟ وہ تو دلی سے بھی بہت آگے ہے۔ دلی سے مراد آباد والی گاڑی تمہیں پکڑنی ہو گی۔"

"اری بی بی، یہ تو بعد کی باتیں ہیں پہلے یہاں سے تو نکلیں۔ ڈوبے پاکستان نے تو ہمارے قدم پکڑ لئے۔"

اخبار والے نے اخبار بند کرتے کرتے ایک لمبی جماہی لی اور بڑبڑایا "اللہ ان لوگوں پہ رحم کرے۔"

سوٹ کیس والا پوچھنے لگا "میں تو اس بھاگ دوڑ میں اخبار ہی نہیں پڑھ سکا۔ کیا خبریں ہیں۔"

اخبار والا اس کی طرف اخبار بڑھاتے ہوئے بولا "وہاں تو قیامت برپا ہے۔" تھوڑا رک کر آپ ہی آپ بولنے لگا "ویسے تو یہ لوگ اہنسا کی مالا جپتے ہیں اور گوتم بدھ کو بھی بہت

کرتے ہیں مگر حال یہ ہے ..... پروفیسر صاحب، آپ کا کیا خیال ہے۔ معاف کیجئے میں نے پھر آپ کو پروفیسر کہہ دیا۔"

وہ مسکرایا "اب یہ آپ کی اپنی ذمہ داری ہے۔ خیر آپ کیا فرما رہے تھے۔"

"دیکھئے آپ تو شاید کچھ کہنا پسند نہ کریں۔ آپ کو تو بہر حال وہاں رہنا ہے۔ مگر ہم میں سے کسی کو تو اس سے پوچھنا چاہیئے۔"

"جانے دیجئے صاحب، کس کس سے آپ پوچھیں گے۔"

"جی؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ زندگی تھوڑی ہے اور پوچھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ کہاں کہاں جا کر کس کس سے کیا کیا پوچھیں گے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اور یہ کہتے کہتے اخبار والا مسافر قریب بیٹھے اس بزرگ سے جو دیر سے آنکھیں موندے بیٹھے تھے مخاطب ہوا "قبلہ آپ کا اس کشت وخون کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

بزرگ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا، تاسف بھرے لہجہ میں بولے "اس کے سوا کیا کہا جائے کہ یہ بنی نوع انسان کی بدبختی ہے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ بس اس وقت سے قتل وخون ہی ہوتا چلا آیا ہے۔"

"مولانا" اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا "اس قتل کے تو کوئی معنی تھے۔"

"کیا معنی تھے صاحب۔" اخبار والے نے تڑپ کر پوچھا۔

"صاحب کوئی کوئی عورت ایسی جانہار ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کے لئے اپنی جان دے دیں یا کسی کی جان لے لیں۔" یہ کہتے کہتے اس نے اخبار والے کی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کی طرف دیکھا جس پہ یاعلی کھدا ہوا تھا۔ "آپ کی انگوٹھی تو اچھی ہے۔ کون سا پتھر ہے یہ۔"

http://www.pakistanplace.com

"درِ نجف۔ اصلی درِ نجف سے یہ۔ بہت نایاب چیز ہے۔ بس اتفاق سے مشہد میں ایک جوہری سے مل گیا تھا۔"

"یا علی بہت خوبصورتی سے کندہ کیا گیا ہے۔" رک کر بولا "معاف کیجیے حضرت علی بھی تو بے معنی قسم کے تشدد کے خلاف ہی تھے۔"

"مولا علی کی کیا بات ہے۔" اخبار والا جوش میں آکر کہنے لگا "اپنے قاتل کو شربت پیش کیا۔ تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں بھی یہی کہہ رہا تھا۔" ایک قتال کے بعد بولا "پچھلے ہفتے یوں ہوا کہ کراچی میں میری مڈھ بھیڑ ایک بھائی سے ہو گئی۔ ایران سے اپنی جان لے کر بھاگا تھا۔"

اخبار والا شخص اس پر کچھ بے مزہ ہو گیا۔ ایک خفیف سے طنزیہ لہجہ کے ساتھ بولا "اس کے بعد آپ کہیں گے کہ پچھلے مہینے لندن میں میری ایک احمدی سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔"

اس پر وہ بیساختہ ہنسا۔ بولا "نہیں صاحب۔ تہتر کے تہتر فرقوں سے ملاقات کا میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ اسی لئے میں کہہ رہا تھا کہ چھوڑیں اس قصے کو۔ اس وقت ہمارا ایک ہی مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا مسئلہ ہے۔" اخبار والے شخص نے کسی قدر تلخ لہجہ میں پوچھا۔

"یہی کہ گاڑی کب چلے گی۔"

اس پر اخبار والے شخص کا موڈ ہی بدل گیا "ارے صاحب، اس گاڑی نے تو حد کر دی۔ لوگ کتنے بے آرام ہیں۔ غریب گاڑی کے انتظار میں بے گھر بے در یہاں پڑے ہوئے ہیں جیسے کوئی ۱۹۴۷ء کا خانہ بربادی قافلہ پڑا ہو۔ بالکل وہی نقشہ ہے۔" پھر تھوڑا رک کر کسی قدر تعجب سے بولا "مگر صاحب کمال ہے، آپ مجھے مطمئن نظر آ رہے ہیں۔ جب سے میں یہاں پہنچا ہوں یہی دیکھ رہا ہوں کہ آپ اطمینان سے کتاب پڑھے چلے جا رہے ہیں۔"

"حضرت بات یہ ہے کہ مجھے سفر بہت کرنے پڑتے ہیں اور گاڑیاں یہاں کی طرح وہاں

بھی لیٹ ہی چلتی ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ جب پلیٹ فارم ہی پہ بسیرا کرنا ہے تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کونسا پلیٹ فارم ہے اور کونسی سرحد میں ہے۔"

اخبار والے شخص نے زہر خند کیا "پروفیسر صاحب، فرق تو پھر بھی پڑتا ہے۔ پاکستان کے پلیٹ فارم پہ آپ کو اتنا اطمینان تو میسر ہے کہ یکسوئی سے کتاب پڑھ سکتے ہیں۔"

قریب ہی کھڑا ایک سسٹم فسر پریشان مسافروں کو سمجھا رہا تھا "بھائی شکر کریں کہ آپ یہاں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ ادھر تو بہت بری حالت ہے۔ ٹرین یہاں سے چلی بھی تو وہ آپ کو اٹاری پہ لے جا کے چھوڑ دے گی اور وہاں آپ پھنس جائیں گے۔"

"جناب بات یہ ہے کہ" ایک نوجوان نے برہمی سے کہا "پھنسے ہوئے تو ہم یوں بھی ہیں اور دوں بھی ہیں لیکن ہم یہاں کیوں پھنسے پڑے رہیں۔ جہاں پھنسنا ہمارا مقدر ہے وہیں جا کر کیوں نہ پھنسیں۔"

اس کی توجہ اخبار والے شخص سے بالکل ہٹ گئی اور اس دور کھڑے غصیلے نوجوان پہ مرکوز ہو گئی۔ اس کی بات بہت غور سے سنی اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ اس نوجوان کی منطق میری منطق سے زیادہ وزنی ہے۔

اسی اثنا شیروانی والے معزز شخص نے اپنی چھڑی کی موٹھ سے ٹھوڑی اٹھائی اور اخبار والے شخص سے مخاطب ہوا "میرے عزیز ہم تو پھنسے ہوئے ہیں ہی مگر آپ گھر بار ہوتے ہوئے یہاں ہمارے ساتھ کیوں خوار ہو رہے ہیں۔"

اخبار والے شخص کو اس اچانک سوال پر کچھ تامل کرنا پڑا۔ سوٹ کیس والا شخص بیچ میں بول پڑا "یہ سوال آپ مجھ سے بھی کر سکتے ہیں۔ مگر مجھے تو ریلوے انکوائری نے گمراہ کیا ورنہ میرے سر میں کوئی پھوڑا نکلا تھا کہ میں بھاگم بھاگ یہاں پہنچتا۔"

اتنے میں ایک افسر نما شخصیت نمودار ہوئی۔ آگے پیچھے کچھ اہلکار۔ ایک ذرا پیچھے ہو کر ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ شاید اس کا اسسٹنٹ تھا۔ افسر موصوف نے لیٹے بیٹھے مسافروں پر کہ پورے

http://www.pakfunplace.com

پلیٹ فارم پر بکھرے پڑے تھے ایک نظر ڈالی۔ اسسٹنٹ سے مخاطب ہوا۔ "یاتری تو یہاں نہیں ہیں۔"

"سرِاں کا الگ انتظام کر دیا گیا ہے۔"

"انہیں کوئی شکایت تو نہیں ہے۔"

"نہیں سر۔ ان کی پوری دیکھ بھال ہو رہی ہے۔"

پھر افسر موصوف لیٹے بیٹھے منتشر مسافروں سے مخاطب ہوئے "آپ لوگوں میں پاکستانی کون کون ہیں۔"

کتنے مسافروں کے ہاتھ ایک دم سے اٹھ گئے۔

"آپ لوگ تو ایسا کریں کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔"

"جی۔ اس کا کیا مطلب ہے۔" کچھ گھبرائی کچھ غصیلی آوازیں۔

"دیکھیے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ٹرین کب چلے گی۔ تو جب آپ کے گھر یہاں موجود ہیں تو آپ لوگ یہاں بے ٹھکانا کیوں پڑے رہیں۔"

سوٹ کیس والا شخص تڑپ کر بولا "مگر میں کراچی سے آرہا ہوں۔"

"تو آپ واپس کراچی چلے جائیں۔"

سوٹ کیس والا شخص اس پر بھنّا گیا "جناب والا میں اتنا کرایہ خرچ کر کے آیا ہوں۔ میں کرایہ خرچ کر کے واپس کراچی جاؤں اور پھر آؤں۔"

"دیکھیے۔ اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں اور نہ جائیں کراچی۔ لاہور میں آپ کا کوئی عزیز رشتہ دار کوئی ملنے والا ہوگا اور لاہور والوں کے لیے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ انہیں واپس جانے میں کیوں تامل ہے۔"

اخبار والا شخص یہ سن کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ قلی کو اشارے سے بلایا۔ پھر گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا "پروفیسر صاحب۔ اگر کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو معاف کر دیجیے۔ ویسے میرا

خیال یہ ہے کہ لاہور میں آپ کا بھی کوئی ملنے جلنے والا ہوگا۔ آپ بھی اٹھ چلیے۔ یہاں رات گزارنا تو بہت مشکل ہوگا۔"

وہ مسکرایا "کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پلیٹ فارم پہ روشنی تو بہرحال ہوتی ہے اور پاکستان کے پلیٹ فارم پر بقول آپ کے اتنا سکون و اطمینان تو ہوتا ہے کہ آدمی یکسوئی سے کتاب پڑھ سکے۔"

اخبار والا شخص یہ سن کر کچھ چپ سا ہوگیا۔ پھر جیب سے وزٹنگ کارڈ نکال کر پیش کرتے ہوئے کہنے لگا "اگر آپ کو کوئی بھی مشکل آئے تو مجھے اس نمبر پہ فون کر لیجیے۔" اور تیزی سے روانہ ہوگیا۔

پاکستانی مسافر جلدی جلدی قلیوں کے سروں پہ سامان لدوا کے واپس جانے لگے۔ افسر موصوف نے اس طرف سے اطمینان حاصل کر کے باقی مسافروں پر ایک نظر ڈالی "میرا مشورہ آپ لوگوں کو یہ ہے کہ آپ یہاں جہاں جہاں ٹھہرے ہوئے تھے فی الحال وہیں واپس چلے جائیں۔"

مسافر اس تجویز پہ بھڑک اٹھے۔ میزبانوں کے گھروں کو واپس جانے کے لیے وہ مطلق تیار نہیں تھے۔

"بہرحال ہم نے تو آپ ہی کی سہولت کی خاطر یہ بات کہی تھی۔ نہیں جانا چاہتے تو بیشک یہاں بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کریں۔ ویسے ٹرین کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔"

ایک مسافر بپھر پڑا "اور پلیٹ فارم پہ ہم کب تک اس طرح پڑے رہیں گے اور جو گرمی کا حال ہے وہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ادھر ہم جو نقدی لے کر چلے تھے وہ ختم ہو چلی ہے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" افسر موصوف نے کہا "مگر دیکھیے آپ لوگ ہماری ذمہ داری تو نہیں ہیں۔" اور پھر فوراً ہی اہلکاروں کے ساتھ واپس ہو لیا۔

مسافر جو افسر کے آنے پر پھریری لے کر اٹھ بیٹھے تھے۔ پھر ڈھیر ہوگئے۔ کتنی دیر تک کوئی کچھ بولا ہی نہیں۔ اب شام ہونے لگی تھی۔ دھوپ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پلیٹ فارم کے

https://www.pakfunplace.com

آس پاس چمک رہی تھی، اب پلیٹ فارم سے بہت دور، بہت دور، پرے خاموش درختوں کی پھنگوں پر جھلملا رہی تھی اور وہاں سے بھی جیسے سرکنے والی تھی۔ سادات ان مسافروں کے سر پہ کھڑی تھی اور سب گم سم بیٹھے تھے، شاید آنے والی رات کے خیال سے۔ نیلے پتلون والا نوجوان شیروانی والے معزز شخص کے تھوڑا اور قریب آ گیا۔ تھوڑا چپ رہ کر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ابا جان، ہم کس کی ذمہ داری ہیں؟"

شیروانی والے معزز شخص نے جو اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کسی قدر چونک کر بیٹے کو دیکھا، کچھ سوچا، پھر اس سے مخاطب ہوا "پروفیسر صاحب، یہ میرا بیٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ ہم کس کی ذمہ داری ہیں۔"

اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر شیروانی والے معزز شخص کو دیکھا، پھر نیلے پتلون والے نوجوان کو نظر بھر کر دیکھا، دیکھتا رہا، پھر کتاب پر نظریں جھکا لیں۔ لیکن اب وہ کتاب پہلی سی یکسوئی کے ساتھ نہیں پڑھ سکا۔ تھوڑی ہی دیر میں دھیان اس کا کتاب سے اُچٹ گیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ یہ تو بالکل شام ہو چکی ہے۔ اب سے ذرا دیر پہلے دور کھڑے درختوں کی پھنگوں پر جو دھوپ جھلملا رہی تھی اب وہاں سے سرک کر گم ہو چکی تھی۔ شام کا سایہ پورے منظر پر پھیل چکا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی۔ خالی تھی۔ ایک طرف پھینک دی۔ نیلے پتلون والے نوجوان سے مخاطب ہوا "میاں ذرا ادھر آؤ۔"

نوجوان قریب آیا۔

"بیٹھو۔"

نوجوان بنچ پر بیٹھ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"مصباح الحسن۔"

"پڑھتے ہو؟"

"جی۔ علی گڑھ میں پڑھتا ہوں، فرسٹ ایئر میں ہوں۔"

شیروانی والے معزز شخص نے بیٹے کے اس بیان کو ناکافی سمجھا، بولا "پروفیسر صاحب، میرا بیٹا میٹرک میں فرسٹ آیا تھا۔ میں تو اسے الٰہ آباد بھیجنا چاہتا تھا۔ مگر علی گڑھ والوں نے مجھ پہ بہت دباؤ ڈالا کہ اسے علی گڑھ میں داخل کراؤ۔ میں نے اسے وہاں داخل کرا دیا۔ یونیورسٹی اسے سکالرشپ دیتی ہے۔"

"ماشاءاللہ۔ صاحبزادے ایک کام کرو گے؟" پھر شیروانی والے معزز شخص سے مخاطب ہوا "میں آپ کے بیٹے سے ایک کام لینے لگا ہوں۔"

"ضرور۔ ضرور۔"

"یہاں آس پاس کہیں سگریٹ ملے گی؟"

"جی ہاں۔ وہ دوسرے پلیٹ فارم پر سٹال ہے۔ وہاں سے لے کر آتا ہوں۔"

"شاباش۔"

"اے بیٹا" پاندان والی بوا نے بٹوا کھولتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا "جا تو رہا ہے۔ میرے لئے چونی کے پان لیتا آئیو۔" بٹوا کھول کے پیسے گنے۔ دیتے ہوئے بولیں "لو میرا تو بٹوا خالی ہو گیا۔"

نوجوان چلنے لگا تھا کہ کسی مسافر نے پیٹ پوجا کا سوال اٹھا دیا۔

"ہاں بھائی، پیٹ پوجا کا بھی تو کچھ انتظام ہونا چاہیئے۔"

"بڑی مشکل ہے۔ پیسے تو ختم ہونے لگے ہیں۔"

"آج تو خیر جیسے تیسے گزارہ کر لیں گے۔ مگر کل کیا ہو گا۔"

"کل کی کل پر چھوڑو۔ آج کی فکر کرو۔ اے میاں صاحبزادے جا تو رہے ہو کسی نان کباب والے سے کہنا کہ بھیا ذرا ادھر کا بھی رُخ کر لے۔"

جب نوجوان چلا گیا تو شیروانی والے معزز شخص نے زبان کھولی "پروفیسر صاحب،

http://www.paktunplace.com

میرا لڑکا بہت ذہین ہے۔ مگر سوال بہت کرتا ہے۔"

"یہ سوال کرنے کی عمر ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ اسی لئے میں اسے سوال کرنے سے کبھی نہیں روکتا۔ کوئی کوئی سوال تو ایسا کرتا ہے کہ مجھے بھی اس کا جواب معلوم نہیں ہوتا۔ مگر میں سوچ لیتا ہوں کہ کوئی بات نہیں عمر کے ساتھ خود اسے اس سوال کا جواب مل جائے گا۔"

"درست فرمایا آپ نے۔ بہت سے سوال ایسے ہیں جن کا جواب آدمی کے پاس نہیں ہوتا، وقت کے پاس ہوتا ہے۔"

"یہ مت کہئے پروفیسر صاحب۔ ایسے سوال بھی ہوتے ہیں جن کا جواب وقت کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ بس یہ عمر کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

وہ چپ ہو گیا جیسے کچھ سوچنے لگا ہو۔ شام اتر تی چلی آ رہی تھی اور گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آخر کو رات ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی پیٹ بھرنے کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا۔ ابھی مسافر حیص بیص میں تھے اور اپنی اپنی جیب کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایک نان کباب والا جسے نیلے پتلون والا نوجوان اشارہ کر آیا تھا آن پہنچا۔ بس پھر تابِ ضبط کیسے رہتی کہ دوپہر سے اب تک ایک کھیل منہ میں نہیں گئی تھی اور کبابوں کی خوشبو اشتہا انگیز تھی۔ بس پھر چل سو چل۔ بہت سوں نے تو نان کباب کے ساتھ کوکا کولا کی عیاشی بھی کر ڈالی۔ کوکا کولا سیلون اپ اور ٹیم سے بھری ہالٹی دیکھتے دیکھتے خالی ہو گئی۔

اس نے بھی تھوڑا بہت کھا کر، ایک پیالی چائے چڑھا کر، سگریٹ سلگا کر اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرتے ہوئے پھر کتاب کھول لی۔ پاندان والی بوا نے کہ نان کباب کھانے کے بعد گلوری منہ میں رکھ لی تھی اور اونگھنے لگی تھیں اسے ایک نظر دیکھا اور بولیں "بیٹے پروفیسر، کیا آج بھی رتجگا کرو گے۔ یہ کتاب تمہیں نکشوائے گی تو نہیں۔ ارے میں کہتی ہوں کہ جتنی دیر تم نے کتاب پڑھی ہے اس سے آدھے وقت بھی کلمہ کا ورد کیا ہوتا تو

ہماری یہ مصیبت ٹل جاتی۔"

پنکھے والی بولی "بوا مجھے تو تمہارے ابا نے ایسی دعا لکھ کے دی تھی کہ اس کا میں نے ورد کیا ہوتا تو گاڑی یوں چٹکیوں میں چلتی۔"

"تو پھر بی بی ورد کیا ہوتا۔"

"بوا کیا بتاؤں چلتے وقت سارا سامان سنگھوا کے رکھا تھا بس جس کاپی میں وہ دعا لکھی ہوئی تھی وہی بھول آئی۔"

"غریب مسافروں کو رنج جو کھینچنا تھا۔"

پھر اس نے کتاب پڑھتے پڑھتے دیکھا کہ دونوں ہی اونگھنے لگی ہیں، ایک گلوری چباتے چباتے دوسری پنکھا جھلتے جھلتے۔ اور ان دونوں ہی پہ کیا موقوف تھا، سب ہی مسافر سوئے ہوئے نظر آ رہے تھے لیٹے ہوئے تو سو ہی گئے تھے جو بیٹھے تھے وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو رہے تھے۔ نیلے پتلون والا نوجوان کروٹ لئے گھٹنے سیٹ میں سمیٹے بے سدھ سو رہا تھا۔ شیروانی والا معزز شخص اپنی اسی مخصوص وضع کے ساتھ چھڑی کی موٹھ پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا اور جاگ رہا تھا۔

"پروفیسر صاحب"، کتنی دیر چپ رہنے کے بعد بالآخر اس معزز شخص نے زبان کھولی۔

"جی؟"

"میری سوال پوچھنے کی عمر تو نہیں ہے، مگر یہ پوچھنے کے لئے میں بھی مضطرب ہوں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ ہم جو یہاں بیچ میں پھنسے پڑے ہیں کہ نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے آخر کس کی ذمہ داری ہیں۔"

پھر وہی سوال۔ وہ کسی قدر پریشان ہو گیا چاہا کہ سوال کو نظر انداز کر کے پھر اپنی

http://www.pakurdubooks.com

کتاب پر جھک جاتے۔ مگر دھیان سٹ گیا تھا کہ اب وہ یکسوئی سے پڑھ نہیں سکتا تھا۔

شیروانی والا معزز شخص اسے تکتا رہا۔ پھر بولا "پروفیسر صاحب، آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"جواب" وہ بڑبڑایا

"ہاں جواب۔ مجھے اپنے بیٹے کو جواب دینا ہے۔"

اس نے تامل کیا۔ پھر بولا "قبلہ، آپ کے سوال کا جواب میرے پاس تو نہیں ہے۔ وقت کے پاس ہو تو ہو۔"

"وقت کے پاس" شیروانی والا معزز شخص سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بڑبڑایا "کیا کہا جا سکتا ہے۔"

چیلیں

تب انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کتنے دنوں سے جیسے صدیوں سے اس اتھاہ بے انت بے اعتبار سمندر میں کہ کبھی شانت دکھائی پڑتا کبھی متلاطم پرشور غضب ناک ہوا ٹھٹھا وہ آس و پاس کے عالم میں ڈول رہے تھے کہ خشکی ان کے لئے خواب بن چکی تھی کہ جیسے جنم جنم سے بھرتے، جھاگ اگلتے پانیوں میں جھکولے کھا رہے ہیں، کھاتے رہیں گے کہ طوفان نے تو بچ نکلنے کی رہی سہی آس کو بھی ختم کر دیا تھا۔ اب جب اچانک طوفان تھم گیا اور بادل چھٹ گیا اور جہاز اس اجنبی ساحل پر آن لگا تو پہلے وہ حیران ہوئے "کیا سچ مچ" اور پھر اطمینان کا سانس لیا کہ کسی طور کنارے تو لگے۔ اطمینان کا سانس لیتے لیتے ایک بے اطمینانی سی ہوئی۔ آخر اتنی جلدی پار اترنے کا کیسے یقین آجاتا۔ اپنے اطمینان کے لئے دور تک چل کر دیکھا کہ کیا واقعی وہ زمین پر ہیں۔ زمین پر چلنا اس وقت ان کے لئے ایک نیا تجربہ تھا کہ ان کے حساب زمین نے اس مبارک گھڑی میں نیا نیا جنم لیا تھا اور انہوں نے نیا نیا اس پر قدم رکھا تھا۔ خشکی کا منظر کتنا بھلا لگ رہا تھا کہ سحر کی مثال ان پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ بس چلتے رہیں، خوب چلے قدم جما جما کر۔ اب انہیں واقعی اعتبار آگیا تھا کہ ان کے قدموں تلے زمین ہی ہے تب انہوں نے سکھ کا لمبا سانس لیا "تو ہم طوفان سے نکل آئے ہیں۔" انیاس نے کہ اس وقت زدہ قافلہ کا سالار تھا اعتماد کے ساتھ اونچی آواز میں انہیں خطاب کیا کہ رفیقو، خداوند کا شکر بجا لاؤ اور شادمانی کرو کہ آخر کے تئیں ہم تاریک پر آشوب پانیوں سے نکل آئے ہیں اور خداوند کی ٹھوس پتھریلی زمین پر چل رہے ہیں۔"

http://www.pakfunplace.com

اطمینان ہوجانے کے بعد اچانک انہیں بھوک لگ آئی۔ اس آشوب میں تو بھوک پیاس چین آرام سب ہی کچھ رخصت ہوگیا تھا۔ دن اور رات کا فرق ہی مٹ گیا تھا۔ ساتھ میں سونے جاگنے کا بھی۔ کب سے نہیں کھایا تھا، کب سے نہیں سوئے تھے۔ مگر اب اچانک بھوک نے ستانا شروع کر دیا۔ ہرے ہرے درختوں کو دیکھا کہ خوش رنگ پھلوں سے لدے پھندے ہیں۔ عجلت کے ساتھ کچے پکے پھل توڑے اور اناپ شناپ کھائے۔

پیٹ بھرنے کے بعد سبزے پر پسر گئے کہ دور تک مخمل کی شال بچھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اب انہیں اپنے ان رفیقوں عزیزوں چہیتوں کی یاد آئی جنہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اور اپنے شہر کی جسے انہوں نے اس عالم میں چھوڑا تھا کہ کوچے بے ربط تھے، مکان جل رہے تھے، مکین بدحواس نکل بھاگ رہے تھے کہ جیسے بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگتے ہیں۔ تب وہ روئے۔ گھروں سے نکلنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے گزرے وقت کو یاد کیا اور روئے۔ اب ہی تو انہیں رنج سفر سے فرصت میسر آئی تھی۔ اس فرصت میں انہوں نے نگر کو، نگر والوں کو جی بھر کر یاد کیا، جی بھر کر روئے۔ سب ہی روئے ماسوا انیاس کے۔ جو ان کے بیچ بڑا تھا اور رعب داب والا سورما۔ یہ الگ بات کہ اس کی سورمائی آخر وقت میں اس کے شہر کے کسی کام نہ آئی۔ سو رونے والوں کے بیچ اس نے اپنے رکھ رکھاؤ کو قائم رکھا۔ مجال ہے کہ اس کی آنکھ ذرا ڈبڈبائی ہو۔ ایک وقار کے ساتھ ان کے بیچ بیٹھا رہا۔ چپ چاپ۔ مگر ان گھڑیوں میں اسے کتنا کچھ یاد آگیا تھا۔ جنگ کے سارے اتار چڑھاؤ، غلبہ، پھر پسپائی، ان کی عیاری، اپنوں کی سادگی کہ بے سوچے سمجھے اس مکر کے پتلے گھوڑے کو ڈھکیل کر شہر کے اندر لے آئے اور پھر کس طرح وہ سورما جو دس برس تک میدانِ جنگ میں گرجتے رہے تھے کچے گھروں کی طرح ڈھیتے چلے گئے۔ اسے اپنا احوال یاد آیا کہ کس طرح خون بھری گلیوں سے گزرتا، لڑتا لڑاتا، زخم کھاتا، زخم لگاتا، خون میں نہایا وہ گھر پہنچا۔ کیا دیکھا کہ اس کا بوڑھا باپ سہمی ہوئی بہو اور دہلے ہوئے پوتے کو سنبھالے بت بنا بیٹھا ہے۔

کتنی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے باپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے باپ یہ زوال کی رات ہے۔ ہمارا شہر بے حرمت ہوا۔ ہمارے سورما مولی گاجر کی طرح کٹتے ہیں۔ بیاہیوں کا سہاگ کنواریوں کی آبرو لٹتی ہے۔ اس سے پہلے کہ اس گھر پہ دشمن یلغار کرے ہمیں چاہیے کہ یہاں سے نکل لیں۔ میرے جوان کیل کانٹے سے لیس جہاز پہ تعینات ہیں۔ صبح ہوتے ہوتے ہم اس آفت زدہ شہر سے دور نکل چکے ہوں گے۔

باپ اسے حیران تکتا رہا۔ پھر گویا ہوا بیٹے میں نے اس شہر کے اچھے دن دیکھے ہیں۔ ان اچھے دنوں میں اس کی دھوپ اور چھاؤں سے توانائی اور آسودگی حاصل کی ہے۔ برے وقت میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔ تو ایسا کر کہ بیوی بیٹے کو لے کر نکل جا۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دے۔"

اس پر اس نے تامل کیا، پھر کہا "اے میرے باپ میں تجھے اس پرآشوب وقت میں اکیلا چھوڑ کر چلا جاؤں، یہ میری سعادت مندی اور میری مردانہ غیرت دونوں سے بعید ہے۔ تو جو باپ کی نیت وہ بیٹے کی نیت۔ آگے جو ہو سو ہو۔ پر میری غیرت کو یہ گوارا نہیں کہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اس اپنے آن والے گھر کو بے آن ہوتے دیکھوں اور چہار دیواری کے اندر مارا جاؤں۔ سو میں اپنی ٹوٹی تلوار کے ساتھ تجھ سے رخصت ہوتا ہوں۔ جب تک دم رہے گا لڑوں گا۔ لڑتے لڑتے جان دوں گا۔"

باپ یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بعد تامل اٹھا اور بیٹے پوتے اور بہو کی ہمراہی میں شہر سے نکل کھڑا ہوا۔ لشٹم پشٹم پہنچنا ان کا جہاز پہ اور کہنا اس کا اپنے رفیقوں سے کہ سورماؤ، مت سمجھو کہ ٹرائے کو ہم چھوڑ رہے ہیں۔ ٹرائے کو ہم ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ ٹرائے ہماری یادوں میں آباد رہے گا اور مقدس دیوی نے کہ میری ماں ہے مجھے بشارت دی ہے کہ یہاں سے نکل کر ہم ایک نئی زمین دریافت کریں گے اور وہاں نیا ٹرائے آباد کریں گے۔

"اے انیاس، رات اب بھیگنے لگی ہے اور سوچ کہ ہم کتنی راتوں کے جاگے ہوئے ہیں۔"

http://www.pakfunplace.com

رفیق کی آواز نے اینیاس کی یادوں کے سلسلہ کو درہم وبرہم کر دیا۔ اس نے ہڑبڑا کر رفیقوں کو دیکھا کہ انہوں نے آنسو پونچھ لئے تھے اور اب اونگھنے لگے تھے۔

"ہاں رفیقو" وہ دکھ بھری یادوں سے بوجھل لہجہ میں بولا "بہت راتیں ہم نے آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ خدا خدا کر کے ایسی رات آئی ہے کہ ہم اطمینان سے سو سکتے ہیں۔ تو آؤ اب سو جائیں۔ صبح ہوتے ہی دیکھیں گے کہ یہ نئی زمین ہمارے لئے کتنی کشادہ ہے۔"

بس ترنت ہی وہ سو گئے۔ ان گنت راتوں کے جاگے ہوئے تھے۔ لمبی تان کر سوئے۔ جاگے اس وقت جب سورج سر پہ آگیا اور جب جاگے تو ایک نیا منظر نظر آیا۔ دھوپ سے بھرا صاف ستھرا نیلا آسمان، نرم ہری بھری گھاس سے ڈھکی ہوئی زمین، خوش رنگ پھلوں سے لدے پھندے اونچے گھنے درخت، گاتے چہکتے رنگ رنگ پرندے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ کھل اٹھے۔ نئی زمین اپنی شادابی کے ساتھ ان کی نظروں میں کھبتی چلی جا رہی تھی اور ان کے تصور میں نئے امکانات کو منور کر رہی تھی۔ بس ایک مرتبہ خیاث نے ضرور تھوڑا وسوسہ کیا تھا۔ چلتے چلتے رکا اور تشویش بھرے لہجہ میں بولا "رفیقو، میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔"

اس پر سب رفیقوں نے اسے غصے سے دیکھا "اے خیاث، بدشگونی کا کلمہ منہ سے مت نکال۔ اتنے دکھ جھیل کر تو، ہم نے یہ سرسبز زمین دریافت کی ہے۔ کیا تو اپنے وسوسوں سے ہمارے اطمینان کو غارت کرنا چاہتا ہے۔"

خیاث چپ ہو گیا۔ کسی قدر نادم ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی ایک دفعہ اس کی بائیں آنکھ پھڑکی تھی مگر اس نے اسے اپنا وہم جانا۔ اندر ہی اندر اپنے وہم کو رفع دفع کیا اور رفیقوں کی خوشی میں شامل ہو گیا۔ کتنے خوش تھے سب رفیق۔ اب انہیں یقین آچکا تھا کہ یہی وہ سرزمین ہے جس کی انہیں بشارت دی گئی تھی اور اینیاس نے ایک عزم کے ساتھ اعلان کیا کہ "رفیقو، یہاں ہم نیا ٹرائے آباد کریں گے۔"

بات دل سے نکلی اور دلوں میں اتر گئی۔ بس تعمیر کے منصوبے بننے لگے ایک نئے ٹرائے کی

تعمیر کے خواب سے شاداباد وہ دن بھر اس جزیرے میں گھومتے پھرتے رہے۔ اس نئی زمین پر چلنا انہیں کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ زمین پر پڑتا ہوا ہر قدم ایک نیا تجربہ تھا۔ ابھرتا ہوا ہر منظر ایک نیا عالم۔ گاتے چہچہاتے پرندے ایک نئی دنیا کے نقیب کہ ہر پرندہ خوش رنگ تھا۔ ہر آواز خوش آہنگ۔ کس شوق کے ساتھ انہوں نے درختوں سے پھل توڑے اور یوں کھائے جیسے جنت کے پھل کھا رہے ہوں۔ وہ تھے بھی تو کتنے رسیلے کتنے لذیذ۔

انہوں نے کئی دن پھل کھا کر گزارے۔ سمجھ رہے تھے کہ وہ جنت میں ہیں اور یہ پھل ہی ان کی مستقل غذا ہیں۔ مگر پھر جلد ہی ان کا جی بھر گیا۔ انہیں اپنے گمشدہ ذائقے یاد آنے لگے جیسے حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کو من وسلویٰ کے ہوتے ہوئے مسور کی دال، پیاز، لہسن اور ادرک کی یاد ستانے لگی تھی۔ انہیں یاد آیا کہ کتنے دنوں سے وہ کھانے نہیں کھائے جو ٹرائے میں کھایا کرتے تھے اور گمشدہ دسترخوان اپنے انواع واقسام کی غذاؤں کے ساتھ ان کے تصور میں گھومنے لگا۔ بس اس تصور کے ساتھ وہ شکار پر نکلے۔ کچھ ہرنوں کا شکار کیا، کچھ پرندوں کو گرایا۔

کس شوق کے ساتھ آگ روشن کی اور کھانے تیار کئے۔ کس تکلف کے ساتھ دسترخوان بچھایا اور کھانے چنے۔ آج وہ کتنے زمانے کے بعد اپنے پرانے ادب آداب کے ساتھ اپنے خاص الخاص کھانے کھانے کے لئے بیٹھے تھے۔ لیکن عجب، ہوا کہ نوالہ ابھی منہ میں نہیں گیا تھا کہ اچانک نہ جانے کس سمت سے چیلیں نمودار ہوئیں اور اپنے اُمنڈ کر آئیں جیسے کالے بادل اُمنڈ کر آتے ہیں۔ دسترخوان پر جھپٹیں۔ کتنا کھایا۔ کتنا گرایا۔ پھر جیسے اچانک ٹوٹ کر گری تھیں۔ ایسے ہی اچانک تر بتر ہو گئیں۔ سب حیران کہ یہ کیا ہوا۔ چیلوں کی اچانک یلغار نے انہیں ہکا بکا کر دیا تھا۔ تھوڑا خوف زدہ بھی۔ ایک دم سے ایک بدشگونی کی فضا چاروں طرف پھیل گئی۔

وہ دسترخوان سے بھوکے اُٹھے۔ تھوڑے وقت کے لئے تو بھوک بالکل ہی غائب ہو گئی لیکن رفتہ رفتہ جب اوسان بجا ہوئے تو بھوک بھی واپس آئی۔ پچھلے روزوں کی طرح

http://www.pakfunplace.com

درختوں سے پھل توڑے اور انہیں کھا کر پیٹ بھرا۔ کل تک یہی پھل جنت کے میوے تھے۔ آج وہ انہیں بدمزہ لگے۔

دوسرے دن انہوں نے پھر ہرنوں اور پرندوں کا شکار کیا۔ پھر اپنی روایتی غذائیں تیار کیں پھر اسی اہتمام سے دسترخوان بچھا۔ کھانے تیار کرنے کی گہما گہمی میں وہ یہ بھول ہی گئے کہ کل کیا ہوا تھا۔ ذوق وشوق کے ساتھ کھانے تیار کئے۔ ذوق وشوق کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانوں کی مہک کے ساتھ کتنے گمشدہ ذائقے تالو اور زبان کے بیچ تازہ ہو گئے۔ لیکن ابھی لقمہ توڑا تھا کہ دور سے بازوؤں کی ناخوشگوار سنسناہٹ سنائی دی اور نخوست بھری کرلاہٹ۔ اوپر نظر ڈالی تو دیکھا کہ چیلیں کالے بادل کی طرح امنڈی چلی آ رہی ہیں۔ بس فوراً ہی دسترخوان پہ ٹوٹ پڑیں۔ کتنا کھایا کتنا گرایا۔ پھر ایک دم سے اڑیں اور نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

پھر وہی حیرت و دہشت۔ مگر آج حیرت کم۔ دہشت زیادہ تھی۔ دہشت کے ساتھ طرح طرح کے وہم۔

غیاث کو جانے کیا وسوسہ ہوا۔ بولا "کیا یہ چیلیں تھیں؟"

اس کے اس سوال نے سب رفیقوں کو ایک شک میں مبتلا کر دیا۔ کچھ دیر تک کوئی کچھ نہ بولا۔ ہر ایک کا دھیان بھٹکا ہوا تھا۔ کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔

"تو کیا یہ چیلیں نہیں تھیں؟" آخر ایک رفیق نے اپنے سب وسوسوں کو قابو میں رکھتے ہوئے احتیاط سے سوال کیا۔

سب کی نظریں غیاث پر جم گئیں۔ غیاث نے بھی فی الحال محتاط لہجہ میں ہی بولنا مناسب سمجھا۔ "رفیقو میں ان چیلوں کو دیکھ کر وہم میں پھنس گیا ہوں۔ تم کہ زیادہ زیرک اور تیز نظر ہو مجھے بتاؤ کہ کیا وہ چیلیں تھیں۔"

الیاس نے یوں رفیقوں کو بھٹکتے دیکھا تو ٹوکا۔ "رفیقو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں وہم نے آگھیرا ہے۔ مگر کیا وہم آدمی کو اتنا اندھا کر دیتا ہے کہ وہ چیل جیسے جانے بوجھے پرندے

کو پہچاننے سے عاری ہو جائے۔ میرے دوستو، میرے کہنے کا اعتبار کرو، مقرر یہ چیلیں ہی تھیں۔ اور چیل اتنا خوفناک پرندہ نہیں ہے کہ آدمی اسے دیکھ کر سہم جائے۔ ہم نے سمندروں کو کھوندا ہے اور اس بلاخیز سفر میں سو طرح کی بلاؤں کا مقابلہ کیا ہے کیا ہم اب اتنے گئے گزرے ہیں۔ کہ چیلوں کا بھی مقابلہ نہ کر سکیں۔ کل کے متعلق میں نے یہ طے کیا ہے کہ کھانے کے ہنگام ہم میں سے چند سورما انہی تلواروں اور تیر کمانوں کے ساتھ پہرہ دیں گے۔"

سو اگلے دن جب کھانے کا وقت آیا تو چند سورما پہرہ دینے پہ کمربستہ ہوئے۔ شمشیر زن تلواریں سونت کر اور کماندار چلہ میں تیر جوڑ کر مستعد ہو گئے۔ لیکن ابھی وہ مستعد ہوئے ہی تھے کہ چیلیں کالے بادلوں کی طرح امنڈ گھمنڈ آئیں اور دفعتاً پہرے داروں پہ جھپٹ پڑیں۔ کہ انہیں لہولہان کر دیا اور پہریداروں کے اوسان ایسے خطا ہوئے کہ چلوں میں جڑے تیر جڑے رہ گئے اور تلواریں جس طرح کھنچی تھیں اسی طرح کھنچی رہ گئیں۔ پھر وہ چیلیں کھانے پہ ٹوٹ پڑیں۔ کھایا، اوندھایا، اور اڑ گئیں۔

کیا کھانے والے اور کیا پہرہ دینے والے، اوسان سب ہی کے خطا ہو گئے۔ جب آئی بلا ٹل گئی تب انہیں ہوش آیا۔ رفقا نے پہرہ دینے والے سوراؤں کو خونم خون دیکھا اور ڈر گئے۔

"کتنی عجب بات ہے۔"

"کیا؟" سب کی نظریں اس رفیق پر جم گئیں۔

"یہی کہ جب ہم یہاں اترے تھے تو ہمیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اس جزیرے میں چیلیں بھی ہیں۔"

"ہاں واقعی کتنی عجب بات ہے۔" دوسرا بولا "اس وقت تو خوش رنگ خوشنوا پرندے ہی اس جزیرے کے پنچھی نظر آتے تھے۔ چیل پر ہماری نظر ہی نہیں گئی اور اب وہ خوش رنگ خوشنوا پرندے جیسے سب اڑ گئے ہوں۔ اب تو یہ لگتا ہے کہ یہ جزیرہ ہے ہی چیلوں

http://www.pakfunplace.com

کا جزیرہ ہے۔"

اس پر ایک رفیق نے اینیاس کی طرف دیکھا اور طنز بھرے لہجہ میں کہا کہ "اے ہمارے نجات دہندہ، کیا یہ ہے وہ سرزمین جس کی تجھے بشارت دی گئی تھی اور تو جس کی ہمیں بشارت دے رہا تھا۔"

دوسرے ایک رفیق نے زہر خند کیا "تو یہ ہے وہ جگہ جہاں ہم نیا ٹرائے آباد کریں گے۔"

رفیقوں کے فقرے اینیاس کو تیر بن کر لگے۔ تاؤ کھا کر اس نے اعلان کیا "رفیقو، کل میں دسترخوان پر پہرہ دوں گا۔ دیکھوں گا کہ چیلیں ہمارے رزق پر کیسے جھپٹا مارتی ہیں۔"

اگلے دن یہی ہوا۔ جب دسترخوان بچھا تو اینیاس تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔ سب رفقا کھانا کھانے کے لئے بیٹھے۔ وہ تلوار سونتے پہرہ دینے لگا مگر پھر وہی ہوا۔ ابھی رفیقوں نے نوالہ توڑا تھا کہ دفعتاً چیلیں کسی نامعلوم سمت سے کرلاتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ اینیاس نے پھرتی سے تلوار کھینچی، مگر جب چیلیں قریب آئیں تو تلوار ہاتھ میں کھنچی کی کھنچی رہ گئی۔ وہ سورما سناٹے میں آ گیا۔ چیلوں نے پھر اسی طرح ندیدے پن کے ساتھ کھایا۔ جو کھانے سے بچ رہا اسے اوندھایا۔ پھر اڑ گئیں۔

رفقا یہ منظر دیکھ کر تو بالکل ہی دہل گئے۔ اینیاس پر انہیں کتنا اعتبار تھا کہ اب تک اس نے ہر بلا کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا اور کامران رہا تھا۔ مگر آج انہوں نے دیکھا کہ وہ چیلوں کے سامنے بے بس ہو گیا ہے اور ایک بڑے خوف نے انہیں آ لیا۔ وہ جنہوں نے یونانی سورماؤں کا بے جگری سے مقابلہ کیا تھا اور سمندر سمندر بلاؤں اور طوفانوں سے ٹکرائے تھے آج چیلوں سے ڈر رہے تھے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ خاموشی اور خوف۔ آخر اینیاس نے اپنی خاموشی توڑی "رفیقو، میں ہار گیا۔"

رفیقوں نے تعجب سے اس کا یہ اعتراف سنا۔ بولے کچھ نہیں۔ حیرت سے اس

کا منہ تکنے لگے۔

"ہاں میں ہار گیا۔ اصل میں میں یہی سمجھا تھا کہ وہ چیلیں ہیں۔"

"تو کیا وہ چیلیں نہیں ہیں۔" ایک دم سے سب چونک پڑے۔

غیاث نے یہ بات سنی اور اعتماد سے کہا کہ "رفیقو، مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا۔"

"رفیق، تو نے صحیح شک کیا تھا۔ اب میں نے دیکھا تو میں نے جانا۔ یوں وہ چیلیں تھیں لیکن ان کے چہرے آدمیوں والے تھے۔"

"آدمیوں والے؟" پھر سب چونکے

"ہاں آدمیوں والے۔"

چیلیں جن کے چہرے آدمیوں والے تھے۔ ایک نئی الجھن۔ ایک نیا خوف۔

"پھر یہ تو کوئی اور ہی مخلوق ہے۔ کونسی مخلوق ہو سکتی ہے۔"

"ہاں یہ کونسی مخلوق ہو سکتی ہے۔"

سب کی عقل چکرا گئی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

کتنی دیر تک وہ اسی ادھیڑ بن میں رہے کہ آخر یہ کونسی مخلوق تھی اور دیر تک ان کی زبانیں گنگ رہیں۔ آخر ایک رفیق بولا "وہ کوئی بھی مخلوق ہو۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ تیری تلوار کو کیا ہوا تھا۔"

اینیاس نے تامل کیا۔ پھر کہا "لڑنے والے کو یہ پتہ ہو کہ وہ کس سے لڑ رہا ہے تب وہ لڑتا ہے۔ یہاں تو مجھے یہ پتہ ہی نہیں چل رہا کہ یہ مخلوق کونسی ہے۔"

پھر سب چپ ہو گئے۔ وہی خوف بھری خاموشی۔ دیر بعد ایک رفیق نے کہا "جہاں سمار اور ق غیر مخلوق غضب کر لیتی ہے۔ وہاں رہنے سے فائدہ۔ بہتر ہے کہ ہم یہاں سے نکل چلیں۔"

"نکل چلیں؟ کہاں نکل چلیں۔"

"جہاں سے ہم آئے ہیں وہیں واپس ہو لیں۔"

http://www.pakfunplace.com

"وہاں ہم اب کہاں واپس جا سکتے ہیں۔" ایک رفیق نے ٹھنڈا سانس بھرا "وہاں تو لوٹانی دندناتے ہیں۔"

"پھر کہیں آگے چلے چلیں۔ یہاں سے تو نکلیں۔"

"آگے؟" رضیہ اس نے تجویز پیش کرنے والے رفیق کو تعجب سے دیکھا "کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ یولیسس کے بچھڑے ہوئے رفیق نے ہمیں آگے کے سفر سے خبردار کیا تھا کہ آگے بھی گردنوں والی بلائیں ہیں کہ کسی جہاز کو خیریت سے نہیں گزرنے دیتیں۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے۔" تجویز پیش کرنے والا رفیق مخمصہ میں پڑ گیا "واپس بھی نہیں جا سکتے۔ آگے جانے کا راستہ بھی بند ہے۔ پھر؟"

"پھر؟" سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

پرانی کہانی

وہ گلی کے اس نکڑ پر سکوٹر تھامے کتنی دیر کھڑا رہا۔ کتنے انتظار کے بعد وہ آئی۔ کتنی گھبرائی ہوئی تھی۔

"بہت دیر لگائی۔"

"بہت مشکل سے نکل کے آئی ہوں۔ اصل میں آج ہمارے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ بہت بہانے کرنے پڑے۔" پھر ادھر اُدھر دیکھ کر گھبرائے لہجہ میں "کوئی دیکھ نہ لے۔"

"تم آج گھر سے نئی تو نہیں نکلی ہو۔"

"وہ نکلنا اور ہوتا تھا۔ اس طرح تو کبھی نہیں نکلی تھی۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کہتے کہتے رک گئی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس ملاقات کو نارمل طریقہ سے نہیں لے رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو کہ یہ چاہنے والوں کی کوئی خفیہ ملاقات ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں کریں گے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ تم اس ملاقات کو نارمل سمجھو۔ جیسے چلتے پھرتے شریفانہ ملاقات ہو۔ کسی دوسرے رنگ میں مت لو۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اس ملاقات کو کوئی رومانٹک ملاقات سمجھ رہی ہوں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ مجھے اپنے آپ کو خواہ مخواہ ایک رومانٹک ہیرو تصور کرنا پڑے گا۔"

http://www.pakfunplace.com

وہ ہنسی "کہیں واقعی آپ اس وقت اپنے آپ کو ہیرو تو نہیں سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"اس پھٹیچر سکوٹر کے ساتھ کون اپنے آپ کو ہیرو تصور کر سکتا ہے۔ ہیرو اگلے زمانے میں ہوا کرتے تھے وہ رومانٹک زمانے گزر گئے۔"

"اچھا یہاں سے تو سرکو۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔"

"ہم کر کیا رہے ہیں جو کوئی دیکھے گا۔ اس زمانے میں کون کسی کو دیکھتا ہے سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ نفسا نفسی کا زمانہ ہے۔ دیکھنے کی فرصت بھی اگلے زمانے ہی میں تھی۔ جب ہی تو عشق کا اتنا چرچا ہو جایا کرتا تھا۔"

"اچھا جلدی کرو۔ یہاں سے تو نکلیں۔ اور آپ چل کہاں رہے ہیں۔"

سکوٹر کی رفتار کسی قدر تیز کرتے ہوئے "ایسا کرتے ہیں کہ شہر سے نکل کر کسی خاموش سے چائے خانے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ گھبرائی "میں بہت دور نہیں جاؤں گی۔"

"پھر یہیں قریب ہی کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"قریب ہی۔" وہ پھر گھبرائی "کوئی دیکھ لے گا۔"

"جب ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے دور چل کر کسی خاموش جگہ بیٹھتے ہیں۔"

"مگر سکوٹر پہ آپ کیوں آئے ہیں۔"

"اس لئے شہسواری کا زمانہ گزر گیا۔ اور کار میرے پاس نہیں ہے۔ ہے تو یہ بہت غیر رومانٹک سواری۔ مگر کیا کیا جائے۔"

"سکوٹر پہ اس طرح بیٹھی ہوئی میں کیسی لگوں گی۔ سب دیکھ رہے ہوں گے۔"

"اس طرح جھجکو گی تو کسی دوسرے کو تو بعد میں شک ہوگا۔ پہلے خود مجھے اپنے آپ پر یہ گمان ہونے لگے گا کہ شاید میں تمہیں....."

"بس بس جلدی کرو۔" اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا "یہاں سے جلدی نکل چلو۔"

"اس بازار میں رش بہت ہے۔ یہاں سے نکل لیں۔ پھر دیکھنا میرا سکوٹر ہوا سے باتیں کرے گا۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ واقعی رش بہت تھا۔ پھر بھی مختلف بازاروں سے وہ تیزی سے گزرا۔ بازاروں، پر ہجوم تنگ راستوں سے گزر کر جب خاموش کسی وہ سڑک پر آیا تو اس نے رفتار اچانک بہت تیز کر دی۔

"آہستہ چلائیے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

"ایسے بیٹھی ہوں جیسے ابھی اچھل کر نیچے جا پڑوں گی۔ بہت غلط سواری ہے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اسے پکڑ کے تھوڑا سہارا لے لیا جائے۔"

"میں جو ہوں۔"

اس نے دیکھا تو تھا کہ پیچھے بیٹھنے والیاں کس طرح سہارا لیتی ہیں۔ بس ایک ہاتھ کمر میں حمائل کر دیا۔ پھر سکوٹر کی رفتار کتنی ہی تیز ہو، اپنے آپ کو محفوظ جانتی ہیں۔ مگر وہ پہلی مرتبہ کسی کے ساتھ اس طرح سکوٹر پہ بیٹھی تھی۔ ایک دم سے اتنی بے حجاب کیسے ہو جاتی۔ مگر سکوٹر اتنا تیز جا رہا تھا کہ اس کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔ لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اڑی جا رہی ہے، جیسے کسی صبا رفتار گھوڑے پر شہسوار کے پیچھے بیٹھی ہے۔ شہسوار کی کمر میں بازو حمائل کئے ہوئے گھوڑا سنسان راہوں پر سرپٹ دوڑا یا تھا۔ اس کی لمبی زلفیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اس تندرست کمر کو اپنے دونوں بازوؤں میں اور زیادہ شدت سے جکڑ لیا۔ آدمی نہ آدم زاد۔ راہ سنسان تھی۔ جیسے بس وہ ہے اور وہ تندرست کمر جسے وہ اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھی اور جس میں پیوست ہوتی چلی جا رہی تھی۔

چلتے چلتے سامنے ایک عمارت کھڑی نظر آئی۔ جان میں جان آئی۔ باگیں کھینچیں۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے دروازے پر دستک دی "کوئی ہے؟" آواز سنسان بیابان میں گونج

http://www.pakfunplace.com

گئی "کوئی ہے؟"

ایک سفید ریش نے اوپر دریچے میں سے جھانکا "اے اجنبی تو کون ہے۔ اس غیر وقت میں یہاں کیوں آیا ہے۔"

"اے صاحب ہم درماندہ مسافر ہیں کہ دور سے آتے ہیں، ہرج مرج کھینچتے یہاں ایسے وقت میں پہنچے ہیں جب شام پڑ چکی ہے اور رات سر پہ کھڑی ہے۔ اس سنسان بیابان میں یہ دروازہ نظر آیا۔ گویا امید کی کرن نظر آئی۔ سوچا کہ کوئی سرائے ہے یا کسی مہربان کا دولت کدہ ہے کیا عجب ہے کہ در ہماری دستک پہ وا ہو۔ اور چند سے سر چھپانے کے لئے جگہ ملے۔"

سفید ریش بزرگ نے غور سے ان دونوں کو دیکھا، تامل کیا۔ پھر دریچہ بند کر لیا۔ یہ دونوں مایوس ہو چلے تھے کہ بند در وا ہو۔ اور جب انہوں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا شمعیں روشن ہیں، فانوس جھلملاتے ہیں، مسندیں بچھی ہیں، گاؤ تکیے لگے ہیں۔ سامانِ ناؤ نوش ہے۔ محفل میں جوش و خروش ہے۔ خدام دست بستہ کھڑے ہیں، خواصیں آ جا رہی ہیں۔ سفر کی ساری تھکان دم بھر میں اتر گئی۔ جی باغ باغ ہوا۔ وصل کا شوق پذیر ہوا۔

"بس اب چلیں"، فرخندہ اب کچھ گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"ابھی سے؟"

"لیجئے اتنی تو رات ہو گئی۔"

"کتنی رات ہو گئی؟" اس نے کلائی پہ لگی گھڑی کو آگے دکھاتے ہوئے کہا "ذرا دیکھو کیا بجا ہے۔"

"میرے لئے تو یہی بہت رات ہے۔ میں کبھی اس طرح سے شام کو نہیں نکلی اور کبھی اس طرح کسی کے ساتھ ریستوران میں نہیں بیٹھی۔"

"اس طرح سے تمہاری کیا مراد ہے۔ ہم کس طرح سے یہاں بیٹھے ہیں۔ شاید ہم

اس طرح سے تو نہیں بیٹھے ہیں۔"

"کس طرح سے؟"

"جس طرح سے تم سمجھ رہی ہو۔"

"میں تو اس طرح سے نہیں سمجھ رہی۔"

"پھر اتنی گھبرا کیوں رہی ہو۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟ مجھ سے؟"

"نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ......"

"پھر وہی بات کہ کسی کو اگر پتہ چل گیا تو...... تو کسی کو پتہ نہیں چلتا"

"گھر میں کسی کو شک ہو گیا تو قیامت اٹھ کھڑی ہو گی۔"

"یہ قیامت تو اب کسی نہ کسی روز کھڑی ہونی ہی ہے۔"

"اچھا چھوڑئیے ان باتوں کو۔ بس اب اٹھ کھڑے ہوں۔"

"مگر پہلے اگلا پروگرام طے ہو جانا چاہیئے۔"

"اگلا پروگرام؟ کیسا پروگرام؟"

"تو کیا یہ آخری ملاقات تھی؟"

فرخندہ اس سوال سے سٹپٹا گئی۔ جھجک کر بولی "نہیں۔"

"تو پھر طے ہو جانا چاہیئے کہ اب کب ملاقات ہوتی ہے اور کہاں ہوتی ہے۔"

فرخندہ نے بہت چوں چرا کی، بالآخر رضامند ہو گئی۔

"تو میں کل سہ پہر کو ٹھیک پانچ بجے اس نکڑ پہ پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں اب نہیں۔ روز روز آپ وہاں آئے تو آس پاس والوں کو شک پڑ جائے گا۔ میں خود آ جاؤں گی۔"

http://www.pakfunplace.com

"اچھا؟ ..... خود کیسے آجاؤ گی۔"

"کیوں۔ آپ نے مجھے بچہ سمجھا ہے۔"

"مگر انتظار مت کرانا۔ ٹھیک پانچ بجے پہنچ جانا۔"

"ٹھیک وقت پر ہی آؤں گی۔ لیکن اگر ٹھیک وقت پر نہ آسکی تو کیا تم چلے جاؤ گے؟"

"نہیں۔ جاؤں گا کیوں۔ انتظار کروں گا۔"

"کب تک انتظار کرو گے۔"

"جب تک تم نہیں آؤ گی۔"

شوخی سے بولی "فرض کیجئے میں عمر بھر نہ آؤں۔"

"میں عمر بھر تمہارا انتظار کروں گا۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔

"اچھا اگر میں نہ آؤں؟"

"نہیں۔ تم آؤ گے۔"

"فرض کرو۔ کہ نہ آؤں۔"

"انہونی کو کیسے فرض کرلوں۔ تم تو مقررہ وقت سے پہلے آن موجود ہوگے۔"

دونوں پھر کھلکھلا کر ہنسے۔ کتنا ہنسے اور کتنی ہنسی خوشی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ مگر ادھر اور ہی گل کھلا تھا۔ آئے بہانوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ خالہ بی کہہ رہی تھیں کہ فرخندہ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"مگر خالہ بی میں تو ....."

"میں تو دیں تو کچھ نہیں۔" خالہ بی نے بات کاٹی "تمہارے امتحان ابھی بہت دور ہیں۔ بہت وقت پڑا ہے پڑھنے کے لئے۔ میں جلدی واپس بھیج دوں گی۔"

اس نے بہت حیلے بہانے کئے۔ کوئی حیلہ بہانہ نہ چلا۔ جانا اس کا ٹھہر گیا تھا۔

گھبراہٹ میں اس نے کئی مرتبہ اس کے دفتر فون کیا کہ اسے بتادے کہ وہ چند دن کے لئے باہر جارہی ہے مگر وہ آنے والی ملاقات کے خیال سے اس روز دفتر ہی نہیں گیا تھا کہ دفتر میں جانے عین وقت پر کیا کام آن پڑے اور وہ دفتر سے بروقت نہ نکل سکے۔

وہ وقت مقررہ پر اس مقام پر پہنچا اور گھڑیاں گننے لگا۔ گھڑیاں گزرتی گئیں گھڑیاں لمبی کھنچتی گئیں۔ اضطراب بڑھتا گیا۔ کھڑا رہا۔ کھڑا رہا۔

تب اس بزرگ نے اس پر ترس کھایا۔ پوچھا کہ اے جوان، میں دیکھتا ہوں کہ اور تو یہاں آتا ہے کھڑا رہتا ہے۔ راہ تکتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ کچھ کہہ تو یہاں کس امید پر آتا ہے اور کیوں اتنا افسردہ ہوکر واپس چلا جاتا ہے۔ آخر وہ کون ہے جس کی تو راہ تکتا ہے۔"

اس نے ایک آہ سرد بھری۔ بولا "اس کی جسے ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی آرزو ہے۔"

یہ سن کر اس بزرگ نے نوجوان کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا "اب میں سمجھا کسی نازنین کے تیز نظر نے تجھے گھائل کیا ہے۔ اے نوجوان اپنی جوانی پہ رحم کھا اور اس خیال خام سے باز آ۔ ایک دفعہ دیکھنے کو غنیمت جان۔ دوسری دفعہ دیکھنے کے خیال سے باز آ۔ ورنہ جان لے کہ دربدری خاک بسری تیرے مقدر میں لکھی گئی۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لاکر بولا کہ "اے بزرگ یہ تو کیا کہتا ہے۔ میں اسی کے وعدے کو کیونکر فراموش کرسکتا ہوں۔ صبح رخصت ہنوز میری آنکھوں میں رم رہی ہے کس دکھے دل کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے وداع ہوئے تھے کس خلوص سے اس نے اسی ساعت میں اسی مقام پر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

بزرگ مسکرایا۔ شفقت بھرے لہجہ میں کہا کہ "عزیز نادان مت بن۔ نازنینوں کے وعدے پر دانا کبھی اعتبار نہیں کرتے کہ وقت اور عورت جاکر واپس نہیں آیا کرتے۔

http://www.pakfunplace.com

انتظار کی گھڑیاں اس شام اس پر بہت سخت گزریں۔ کتنی بار اس نے بزرگ کے کہے ہوئے کو یاد کیا۔ کتنی بار منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "عورت اور وقت" اور اس خیال کے ساتھ وہ کتنا افسردہ ہوا۔ جب پلٹا تو اسے لگا کہ وہ ڈھے چکا ہے۔

"اماں جی میں خود ثریا کے گھر جا رہی ہوں"

"بیٹی سفر کی تکان تو اتار لو"

"اماں جی ثریا سے میرا ملنا بہت ضروری ہے"

"ثریا سے ملنے کو میں تھوڑا ہی منع کر رہی ہوں۔ مگر میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اتنے لمبے سفر سے آئی ہو۔ پہلے ہی تھکی ہوئی ہو اور تھکاؤ گی تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔ ثریا سے کل مل لینا"

"نہیں اماں جی" فرخندہ نے بڑی بے چینی کے ساتھ کلائی پر لگی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا "زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی۔ جلدی آجاؤں گی"

اس نے روز کے پروگرام کے مطابق دن ڈھلے گھڑی پر نظر ڈالی۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے، سکوٹر پہ بیٹھا اور روانہ ہوا۔ مگر آج عجب ہوا۔ بیچ رستے میں سکوٹر خراب ہو گیا کتنی دیر تک سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر وہ سٹارٹ ہو کر ہی نہیں دیا۔ کتنی مشکلوں سے گھسیٹ کر ایسے وہ ایک میکینک کے پاس لے گیا۔ بار بار بے چین ہو کر گھڑی دیکھتا تھا اور تقاضا کرتا تھا کہ "ذرا جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے"

اسی وقت اس راہ سے ایک جوگن گزری۔ دیکھا کہ ایک نازنین چند سے ماہتاب اکیلی بے حال پریشان بھٹکتی پھرتی ہے۔ جیسے کسی کو ڈھونڈتی ہے اس نے اس نازنین کے حال پہ ترس کھایا۔ سوچا کہ ضرور کوئی دکھ کی ماری ہے۔ زمانے کی ستائی ہے کہ اس سنسان بن میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ اس کے پاس گئی۔ پوچھا کہ "اے نازنین تجھ پر کیا ایسی افتاد پڑی ہے کہ ایسے وقت میں جب دن ڈوب رہا ہے

اور آگے پہاڑ سی رات کھڑی ہے۔ تو جوان جہاں اس سنسان بن میں اکیلی بھٹکتی پھرتی ہے۔

اس پر وہ روئی۔ اپنا سارا احوال سنایا اور کہا کہ "میں یہ اعتبار کر کے کہ وہ مقرر میرا انتظار کرتا ہو گا میں یہاں آئی۔ مگر یہاں کسی کو نہ پایا۔ ملنے کی امید لے کر آئی تھی۔ یہاں آ کر اور بھی پریشانی دامنگیر ہوئی کہ جانے اس پر کیا گزری کہ اس نے کیا ہوا وعدہ توڑا اور یہاں آ کر میری راہ نہیں دیکھی"

یہ سن کر وہ جوگن ہنسی اور بولی کہ اری نیک بخت تو کتنی نادان ہے کہ تو نے مرد کے وعدے پر اعتبار کیا۔ مرد کی ذات بے وفا ہے۔ اس کا عشق دھوکا ہے۔ یہ بد ذات معشوقہ سے قرب حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ کیسا اپنی جان کو کھوتا ہے۔ بنوں کی خاک چھانتا ہے۔ مگر آرزو سے وصل پوری ہو جانے کے بعد طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ رخصت ہوتے ہوئے دعوے وعہد کرتا ہے۔ لیکن آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ پھر کہیں وعدہ کہاں کی وفا۔ سب کچھ بھول جاتا۔ سوائے نازنین جان لے کہ وہ نگوڑا تجھے بھول گیا۔ تو بھی اسے بھول جا۔ وصل کی جتنی لذت تجھے حاصل ہونی تھی حاصل ہو گئی۔ اسی کو اپنی عجلت کا حاصل جان۔ اور واپس چلی جا ورنہ تیرے لئے خواری ہی خواری ہے"

جوگن کی یہ بات سن کر اس نے بہت غم کیا، اشکوں سے منہ کو دھویا۔

اور جب سکوٹر ٹھیک ہوا تو اس نے تیزی سے سکوٹر سٹارٹ کیا۔ فل سپیڈ پر اسے چلایا اور وہاں پہنچا۔ سکوٹر رکھ کر تیزی سے اندر گیا۔ اپنے اسی گوشے میں بیٹھ کر چائے کے لئے آرڈر دیا۔ جب گھڑی پر نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ آج جو بہت تاخیر سے پہنچا ہے پہلے پریشان ہوا۔ کاؤنٹر پر جا کر پوچھا بھی کہ کسی نے یہاں آ کر مجھے پوچھا تو نہیں تھا۔ پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر پریشان بیٹھا رہا۔ پھر سوچا کہ وقت پر آ بھی جاتا تو کیا ہوتا۔ اسے کونسا آجانا تھا۔ اس خیال کے ساتھ افسردہ ہو گیا کتنی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ پھر مایوسانہ وہاں سے اٹھا۔ سکوٹر پہ بیٹھا اور واپس چلا گیا۔

http://www.pakistanipoint.com

دسواں قدم

ایک دو دس، تیتر کی توڑوں نس، بھتیر کا کھولوں تالا، تو گن لے پورے بارہ۔ بارہ سے پہلے گن لے دس، نہ کہہ ڈس۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، قدم قدم کر کے نو گنے۔ پر دسویں قدم پہ وہ ڈسا گیا اور بدل گیا۔ نل پہلے حیران ہوا، پھر وسوسے میں پڑ گیا، پھر رنج کرنے لگا۔ حیران کہ اچھا میں بدل گیا ہوں۔ پھر وسوسہ کہ شاید یہ محض وہم ہو۔ پھر رنج کہ سب کچھ تو چلا گیا تھا، بس ایک اپنا آپا ہی تو رہ گیا تھا سو وہ بھی گیا۔

اور جب راجہ یدھشٹر اپنے راج پاٹ سے لے کے رانی دروپدی تک اپنا سب کچھ چوسر میں ہار کے اپنے بھائیوں کو سنگ لے دکھی من کے ساتھ بنوں میں نکل گئے تو برہدس رشی وہاں پہ پہنچے اور یوں بولے کہ "ہے کنتی کے پوت مت جان کہ تو اکیلا دکھی ہے جگ میں بہت دکھ ہے اور بہت دکھی ہیں۔"

راجہ یدھشٹر نے کہ اس سمے بہت نراس بیٹھے تھے، ٹھنڈا سانس لے کے کہا "پر میں نرالا دکھی ہوں کہ راج پاٹ تو ہارا ہی تھا، رانی کو بھی ہار بیٹھا۔"

"تجھ سے بھی نرالا دکھ راجہ نل کا تھا۔"

"وہ کس پرکار؟"

"راجہ، وہ اس پرکار کہ تیرا آپا تو تیرا ہے، پر نل پہ تو ایسی بپتا پڑی کہ وہ اپنا آپا بھی کھو بیٹھا۔"

اور راجہ نل جب دسویں قدم پہ ڈسا گیا اور بدل گیا تب اس نے جانا کہ اس کی

بدبختی کی انتہا ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی بیتے دن، اگلی پچھلی باتیں سب اس کے تصور میں پھر گئیں۔ وہ زمانہ جب اس کے حسن و خوبی کی، اس کی شان و شوکت کی دور دور دھوم مچی تھی، تاج و تخت کا مالک تھا۔ دولت کی گنگا بہتی تھی۔ ہاں دل زندہ تھا۔ دیدار کے لئے تڑپتا تھا، ہجر کی آگ میں جلتا تھا مگر کس کے ہجر کی آگ میں۔ نرالا ہجر تھا کہ پتہ نہ چلتا تھا کہ آگ کس نے لگائی ہے اور تڑپ کس کے دیدار کے لئے ہے۔ یہ تو راج ہنس نے جسے اس نے ریشمی جال ڈال کر پکڑ لیا تھا اسے بتایا کہ وہ کون ہے اور کیسی ہے، گوری رنگت، ماتھا چاند جیسا، ٹھوڑی سیب ایسی، ہونٹ پنکھڑیاں گلاب کی سی، سینے پہ کلیاں ادھ کھلی براجیں۔ دو جانگھ گویا کشیدہ شمشاد مشہور بنام خود دمن ہے بے شبہ جمال کا چمن ہے۔ وہ تو سن کر تڑپ گیا کہ فوراً ہی راج ہنس کو آزاد کیا اور پیامی بنا کر دمینتی کی طرف بھیجا۔ وہ پہلے ہی اس کے نام کی مالا جپتی تھی۔ اب جو راج ہنس سے اس کی خوبیاں سنیں تو بے تاب ہو گئی۔ کیا عشق تھا کہ سوئمبر میں آن بان شان والے راجہ مہاراجہ ہی نہیں دیوتا بھی آئے بیٹھے تھے۔ مگر اس نے جے مالا اسی کے گلے میں ڈالی۔ دعائیں دینے والوں نے دعائیں دیں کہ چاند سورج کی جوڑی بنی رہے۔ مگر کالی کا دل کتنا کالا تھا کہ یہ خبر سن کر اس کے حاسد بھائی پشکارا کے پاس پہنچا۔ "اے پشکارا، تو نل سے چوسر کھیل۔ میں تجھے جتواؤں گا۔"

"نل کو میں نے کبھی بازی ہارتے نہیں دیکھا۔ تو مجھے کیسے جتوائے گا۔"

"میں اس کے بھیتر گھس کے بیٹھ جاؤں گا۔ اندر سے کارروائی کروں گا۔ دیکھنا اس کی ہر چال غلط جائے گی۔"

ایسا ہی ہوا۔ باہر کے دشمن سے نبٹا جا سکتا ہے۔ مگر اندر کے دشمن سے نبٹنا مشکل ہے۔ اس نے جو بازی چلی غلط چلی۔ ہارتا چلا گیا۔ سب کچھ ہار دیا۔ تن کے کپڑے تک ہار بیٹھا۔ بدن پہ بس ایک لنگوٹا رہ گیا۔ اس حال میں وہ اپنی راجدھانی چھوڑ جنگل کی طرف نکل گیا۔ دمینتی ساتھ تھی۔ بھوکا پیاسا چلا جاتا تھا کہ ایک پیڑ پہ تین چڑیاں بیٹھی دکھائی دیں۔ سوچا کہ کسی طور ان چڑیوں کو پکڑوں اور بھون کر کھاؤں کہ پیٹ کی آگ بجھے۔ یہ سوچ لنگوٹا اپنے بدن سے اتار چڑیوں

http://www.pakfunplace.com

پر پھینکا۔ مگر چڑیاں چالاک نکلیں کہ تہ کو چونچ میں پکڑا اور پھر سے اڑ گئیں۔ تب اس نے دمینتی کی ساڑھی سے ایک دھجی پھاڑی اور اس کی لنگی سے آگا پیچھا ڈھانکا۔ دمینتی سے منت کی کہ نیک بخت، مجھے میرے حال پہ چھوڑ۔ تو اپنے باپ کے پاس چلی جا۔ جب میرے دن پھریں گے پھر میں تجھ سے آکر ملوں گا۔ وہ وفا کی پتلی پتی کی یہ بات سن کر دھاروں روئی۔ ساتھ نہیں چھوڑنا تھا نہیں چھوڑا۔ تب اس نے کیا کیا کہ ایک رات دمینتی کو سوتا چھوڑ چپکے سے کھسک گیا۔ اب وہ اکیلا تھا اور جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ چلتے چلتے کیا دیکھا کہ آگے بن میں آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ قریب گیا۔ دیکھا کہ درختوں کا ایک جھنڈ دھڑ دھڑ جل رہا ہے اور اس کے بیچ ایک سانپ گھرا ہوا ہے۔ کنی کاٹ کر چلنے لگا تھا کہ آواز آئی "نل میں ناگ راجہ ہوں مجھے آگ سے نکال۔" وہ اس درد بھری آواز کو سن کر بیتاب ہو گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، آگ میں چھلانگ لگا دی کہ ناگ راجہ کی کسی طور جان بچائے۔ پر اٹھائے کیسے۔ وہ تو بہت موٹا اور لمبا تھا کہ اس سے اٹھائے نہ اٹھا۔ ناگ راجہ اس کی ناتوانی دیکھ سمٹ کر بالشت برابر بن گیا اور اس کی مٹھی میں آ گیا۔

آگ سے باہر آکر وہ ناگ کو چھوڑنے لگا تھا کہ ناگ بولا "نل، یوں مجھے مت چھوڑ۔ دس قدم چل۔ دسویں قدم پہ مجھے چھوڑ دیجیو۔ اس میں میرا بھی بھلا ہے تیرا بھی بھلا ہوگا۔"

اس نے کہا کہ اچھا، اور قدم قدم گنتا چلا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔ نویں قدم تک خیریت رہی۔ پھر اس نے دسواں قدم اٹھایا اور کہا دس۔ سانپ نے سنا۔ ڈس۔ بس ڈس لیا۔ ناگ راجہ تو ڈس کر پہلے جیسا ہو گیا، اتنا ہی لمبا اتنا ہی موٹا۔ مگر وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ گورا بدن کالا پڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹیڑھے میڑھے ہو گئے۔ چہرہ مسخ ہو گیا، جیسے اب وہ نل نہ رہا ہو، کوئی اور دیلا بن گیا ہو۔ اور وہ بھوچکا رہ گیا کہ یہ کیا اکی اس کے ساتھ ہوا کیا۔

نل بدل جانے کے بعد دیر تک اس حیص بیص میں رہا کہ وہ وہی ہے، یا کوئی اور بن

گیا ہے۔ اپنے آپ کو دیکھتا تھا اور حیران و پریشان ہوتا تھا کہ یہ میں ہوں۔ میں ایسا تو نہیں تھا تو کیا میں بدل گیا ہوں۔ مگر دیر تک وہ یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوا کہ وہ بدل گیا ہے۔ دل ہی دل میں اپنے آپ سے بحث کرتا رہا کہ کہیں آدمی اس طرح بھی بدلتا ہے؟ نہیں میں نہیں بدلا ہوں۔ شاید ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ آدمی بدل جاتا ہے مگر آسانی سے یہ قبول نہیں کرتا کہ وہ بدل گیا ہے۔ مگر جب وہ اپنے تن کی طرف دیکھتا تھا تو اس کا اعتبار ڈھینے لگتا تھا۔ اپنا تن اسے اپنا تن نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس اسی سے وہ وسوسہ میں پڑ گیا تھا کہ شاید وہ بدل گیا ہو۔ رفتہ رفتہ اسے یقین آ گیا کہ وہ بدل گیا ہے۔ تب اس نے رنج کیا کہ اس کے پاس رہ کیا گیا تھا۔ ایک اپنا آپا ہی تو رہ گیا تھا، سو اس سے بھی گیا۔ تو اب کا اس نے ایک اذیت کے ساتھ سوچا، میں اب میں نہیں رہا۔ پھر اپنے کیے پر پچھتایا "اے سانپ، آخر کو تو سانپ ہی نکلا۔ میں نے تیرے ساتھ بھلائی کی تھی۔ بھلائی کا تو نے مجھے یہ بدلا دیا۔"

سانپ سسکنے لگا تھا۔ نل کا یہ کلام سن کر ٹھٹھکا۔ بولا "اے نل، میں نے جو بھی کیا ہے تیرے بھلے کے لیے کیا ہے۔ ذرا سوچ کہ لوگ تجھے اس حال میں کہ بدن پر ایک دھجی کے سوا کچھ نہیں ہے دیکھتے تو کیا کہتے۔ شکر کر کہ تو جگ ہنسائی سے بچ گیا۔ اب تجھے کوئی پہچان نہیں سکے گا۔"

اس پر وہ اپنے دکھ کو بھول گیا۔ تعجب میں پڑ گیا "واقعی؟ کیا اب مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔"

"ہاں اب تجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔"

نل نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ جگ ہنسائی سے بچ گیا اور ناگ راجہ نے چلتے چلتے اسے ایک مشورہ دیا "دیکھ، اجودھیا یہاں سے قریب ہے۔ وہاں راجہ رتپرن راج کرتا ہے اور چوسر کے کھیل میں ماہر ہے۔ تو اس کے پاس جا۔ اس پہ اپنا ہنر ظاہر کر۔ وہ تجھے اپنا ہنر سکھائے گا۔"

ناگ راجہ یہ کہہ کے سٹک گیا۔ نل مطمئن چلنے لگا اس کھٹکے سے آزاد کہ کوئی اسے پہچان

http://www.pakfunplace.com

لے گا تو کیا کہے گا۔ مگر ساتھ ہی ایک احساس یہ بھی تھا کہ جیسے اس سے کچھ چھن گیا ہے۔ جیسے ناگ راجہ جلتے جلتے اس سے کچھ چھین کے لے گیا ہے اور چلتے چلتے ایک مرتبہ پھر اسے خیال آیا کہ اچھا تو اب مجھے کوئی پہچان نہیں پائے گا۔

نل کہ بدل چکا تھا اور اپنی پہچان کھو چکا تھا اس جنگل سے ایسے نکلا جیسے وہاں اپنے آپ کو چھوڑ کے جا رہا ہو۔ جنگل سے نکل کے وہ اجودھیا کی طرف ہو لیا۔ ناگ راجہ کا مشورہ اسے یاد تھا۔ راجہ رتپرن کے دربار میں پہنچا۔ کہا کہ "اے راجہ مجھے باہنک کہتے ہیں گھوڑوں کا داشناس ہوں۔ کھانا پکانے کے فن میں طاق ہوں۔

گھوڑوں کے ہنر میں ہوں یگانا
اور خوب پکا دیتا ہوں کھانا
سب گن میں کہاں تلک بکھانوں
ہر ایک ہنر میں خوب جانوں

راجہ رتپرن بھی مردم شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ آدمی کام کا ہے۔ اسے ملازم رکھ لیا اور اصطبل اور مطبخ دونوں کا داروغہ بنا دیا۔

نل کہ بدل چکا تھا اور اپنی پہچان کھو چکا تھا۔ باہنک بن کر رتپرن کے گھوڑوں کو سدھانے لگا اور کھانے انواع و اقسام کے پکانے لگا۔ جو کہا کر کے دکھایا۔ سائیسی علم دریا ہے۔ اور وہ اس دریا کا آشنا اور تھا کھانوں میں بھی وہ ہنر دکھایا کہ ایک ایک کھانے کے سو سو رنگ دکھائے۔ ہر رنگ میں وہ ذائقہ کہ آدمی کا پیٹ بھر جائے، نیت نہ بھرے۔ راجہ رتپرن نل سے خوش تھا کہ ہنرمند ملا ہے نل اپنی جگہ پر خوش کہ جنگلوں کی خاک چھاننے سے نجات ملی۔ پھر یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ کوئی پہچان لے گا تو کیا کہے گا کہ راجہ ہو کے سائیسی کرتا ہے اور رسوئی پکاتا ہے مگر جب دیکھنے والے اسے دیکھ کے اس کے ہنر کی داد دیتے اور نہ پہچان پاتے کہ سائیس اور رسوئیا کے بھیس میں کوئی راجہ ہے تو غم کھاتا کہ اچھا اب میں اپنے

آپ سے بالکل گیا کہ کوئی مجھے پہچانتا ہی نہیں۔ یہ غم اس کے اندر پکتا رہا، بڑھتا رہا۔ پہلے ایسا خیال اسے کبھی کبھی آتا تھا۔ پھر بار بار آنے لگا اور پھر مستقل رہنے لگا۔ بس اسے گھن سا لگ گیا اور اپنا وجود بے معنی نظر آنے لگا۔ سوچتا رہتا۔ کڑھتا رہتا کہ جب میری کوئی پہچان ہی نہیں ہے تو میرا وجود ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا۔ مگر، وہ سوچتے ہوئے ایک اور طرف بہہ نکلا، آدمی کا کوئی وجود ہوتا ہے تب ہی وہ پہچانا جاتا ہے۔ پہچانا وہی جائے گا جو ہے۔ تو کیا میں نہیں ہوں۔ اسے لگا کہ جیسے سچ مچ نہیں۔

"سنو رے کنتی کے پوت مت جان کہ تو اکیلا دکھی ہے۔ سب سنسار دکھ میں ہے اور ہر جنے کے لئے اس کا دکھ سب دکھوں سے بھاری دکھ ہے۔"

"ہاں رشی مہاراج جو تم نے کہا وہ میں نے جانا۔ سانچ ہے۔ یہ جانا کہ پانڈووں کا تیرھواں برس نل کا دسواں جگ ہے۔" کہتے کہتے یدھشٹر نے ٹھنڈا سانس بھرا "دربھاگ پانڈووں کے کہ تیرھویں برس میں آ کے وہ پانڈو نہیں رہے"

"ہے پانڈو کے پوت کہ تو بھارت بنس بیچ نرگا وسمان ہے، یہ تو نے کیسے جانا کہ پانڈو اب پانڈو نہیں رہے۔"

"رشی مہاراج، یہ میں نے ایسے جانا کہ بارہ برس پانڈووں نے کشٹ کھینچے، کیا کیا دکھ جھیلے، پر رہے وہ پانڈو ہی۔ سب پہچانتے تھے اور مانتے تھے۔ پر تیرھویں برس میں ہم نے سمجھوتے کو نباہتے ہوئے ایسا جتن کیا کہ ہم پہچانے نہ جائیں۔ بس پھر ہماری پہچان ہی جاتی رہی۔ ایسے بدلے ہیں کہ ہم اب کسی سے کہیں بھی کہ ہم پانڈو ہیں تو کوئی نہیں مانے اور پہچانے گا۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ بہروپ ہی ہمارا اتم روپ ہے۔ نکل سائیس، سہدیو گوالا، بھیم رسوئیا، ارجن ہیجڑا،" ارجن کی بات کرتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا "اس کی ویرتا کی کتنی چرچا تھی۔ اس دھرتی پہ کون مائی کا لال اس کی ٹکر کا سورما تھا۔ اب کیسا بدلا ہے کہ مردانگی ہی جاتی رہی۔ اروسی نے ایسا سراپ دیا کہ کام شکتی ہی سے گیا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی

http://www.pakfunplace.com

بنسری۔ مردوں والی نشانی ہی غائب خلہ ہو گئی۔ پھر کام شکتی کا کیا کام۔ پھوٹے بھاگ ہمارے کہ میں راجہ بیراٹ کی چاکری کرتا ہوں ادھر ارجن بیجڑا بن کے ناچتا گاتا ہے اور مہارانی کے منورنجن کا سامان کرتا ہے۔ نام بھی بدلا گیا ہے۔ اب وہ ارجن نہیں۔ برہنالا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

برہ دس رشی بولے مہے راجہ شوک مت کر۔ اس میں بھی ایک بھید ہے۔ ارد سی نے ارجن کے ساتھ وہی کیا جو وشنو جی نے نارد منی کے سنگ کیا تھا۔"

"وشنو جی نے نارد منی کے سنگ کیا کیا تھا"

"مت پوچھ کہ کیا کیا تھا۔ نر سے ناری بنا دیا۔"

"نر سے ناری بنا دیا؟ وہ کیسے؟"

"ایسا ہوا کہ ایک بار نارد منی کو یہ جاننے کی چینک ہوئی کہ وشنو جی کی مایا کا بھید کیا ہے۔ پہنچے وشنو جی کے پاس۔ ڈنڈوت کی اور پوچھا ہے۔ دیو تمہاری مایا کا بھید کیا ہے۔ وشنو جی نے نارد منی کو دیکھا، پھر اس تلیا کو دیکھا جو سامنے ہی امنڈی ہوئی تھی۔ پھر تلیا کی اور اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ نارد جی اس تلیا میں تنک ڈبکی تو لگاؤ۔ نارد منی جھٹ تلیا میں کود پڑے۔ ڈبکی جو لگائی تو بس بدل گئے بدل کے ناری بن گئے۔ ناری کا نام ٹھہرا سوشیلا کہ بنارس کے راجہ کی پتری بنی اس کا بیاہ ہوا۔ پتی نے پتنی جان کے بھوگ کیا۔ بچہ ہوا۔ پھر ایسا ہوا کہ پتا اور پتی میں ٹھن گئی۔ لڑائی ہوئی۔ رن پڑا۔ ایسا رن پڑا کہ دونوں ہی مارے گئے۔ سوشیلا روتی سر پیٹتی رن بھوم پہنچی۔ پتا اور پتی دونوں کے لئے بلاپ کیا۔ پھر ستی کے ساتھ ستی ہونے کے لئے تیار ہوئی۔ پر ادھر جلتے بھڑکتے الاؤ میں اتری ادھر الاؤ ٹھنڈا ہو گیا۔ ٹھنڈا ہو کے پھر وہی تلیا بن گیا۔ سوشیلا پھر سے نارد منی بن گئی۔ منی جی چلا رہے تھے کہ مجھے نکالو۔ وشنو جی نے اشارہ کیا اور وہ تلیا سے نکل آئے۔ بھوچک رہ گئے کہ یہ سب کیا تھا۔ وشنو جی مسکائے اور بولے، یہ ہے میری مایا جس کا بھید کوئی نہیں جان سکتا۔"

پھر جب رات ہوئی تو مینا کے بچے نے پھر تقاضا کیا کہ ماں میری کہانی سنا۔ وہی والی کہانی جس میں تاج الملوک کی جنس بدل جاتی ہے۔

مینا شروع ہو گئی "وہ قصہ عجب ہے۔ مرد عورت بن جائے غضب ہے۔ ہوا یوں کہ تاج الملوک آوارہ و سرگرداں چلا جا رہا تھا کہ راہ میں ایک حوض آیا۔ حوض سنگِ مرمر کا، پانی موتی جیسا۔ سہانی تھاؤں۔ ٹھنڈی چھاؤں۔ تھکا ہارا تو تھا ہی۔ ٹوپی اور عصا کو درخت کے نیچے رکھ کپڑے اتار حوض میں اتر پڑا۔ غوطہ مار کے سر جو نکالا تو حوض گم، ٹوپی اور عصا غائب۔ اپنے تن پہ جو نظر کی تو دیکھا کہ علامت مردی کی ندارد، ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ، پستانیں عیاں، عیاں راچہ بیاں۔

تاج الملوک ابھی اس انقلاب پر حیران ہوتا تھا کہ ایک جوان وہاں آن دھمکا۔ جیسے ہی دیکھتے ہی اس خوبرو پر عاشق ہو گیا۔ فوراً ہی شادی کا پیغام ڈال دیا۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ یہ اس کی جو رو وہ اس کا میاں۔ شبِ عروسی میں وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ حمل ٹھہرا۔ نو مہینے کے بعد پھول سا لڑکا ہوا۔

چالیسویں روز ایک حوض نے کہ گھر سے نزدیک ہی تھا۔ اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہاں جا کر غوطہ مارا۔ سر جو نکالا تو دیکھا کہ نہ وہ سرزمین نہ اپنی وہ صورت۔ پھر عورت سے مرد بن گیا تھا، مگر کالا توا جیسے کوئی حبشی جوان ہو۔ اس تبدیلی کو غنیمت جانا۔ کہا کہ الحمدللہ، اگرچہ جمال اصلی تو نہیں ملا، مگر عورت سے مرد تو ہوا۔

ابھی اس خیال میں تھا کہ ایک حبشن نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر شور مچانے لگی کہ اے کمبخت تین دن سے گھر میں دانہ نہیں۔ بچے بھوک سے بلکتے ہیں۔ تیرا جنازہ نکلے، تو کہاں جا چھپا تھا۔ پھر چیخ چلا کے مزم پڑی اور بولی۔ اچھا خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تو لکڑیاں کاٹ کے لا اور ان کو بیچ کے سودا سلف خرید کر چولہا گرم کروں اور ہنڈیا پکاؤں۔

وہ اس حبشن سے کلہاڑی لے کے جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہاں ایک حوض نظر پڑا۔

http://www.pakfunplace.com

دل میں سوچا کہ دوبار حوض میں غوطہ مارا۔ دونوں بار صورت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ تیسری دفعہ بھی ازماؤ اور دیکھو کہ پردہ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ بس فوراً ہی حوض میں چھلانگ لگا دی۔ غوطہ مار کے سر باہر نکالا تو دیکھا کہ وہی سنگِ مرمر والا حوض ہے۔ درخت کے نیچے لاٹھی اور ٹوپی رکھی ہوئی ہے۔ خود پر نظر ڈالی، جیسا تھا پھر ویسا ہی ہو گیا تھا۔ سجدہ شکر کا بجالایا۔ توبہ کی کہ اب کسی حوض میں غوطہ نہیں لگاؤں گا۔ چلا پھر بن بن کی خاک چھانتا، ہر ہر مرج کھینچتا۔

اور دمینتی کتنے دنوں تک بوئے آوارہ اس بن میں پھرتی رہی، نل کے لئے نالہ وزاری کرتی پھری۔ کیا کہار سنج کھینچے کہ کبھی ناگ کی پھنکار، کبھی شیر کی دہاڑ، کبھی کسی بدنظر کی نظر کا شکار، کبھی جاڑا پالا، کبھی اندھی بارش۔ ہر بلا سے بچتی بچاتی ٹھوکریں کھاتی، خاک بسر، دربدر، آخر کو اسی ڈیوڑھی پہ پہنچ گئی جہاں سے اس کی ڈولی نکلی تھی۔ راجہ بھیم نے بیٹی کو دیکھ کر سینے سے لگایا، دلاسا دیا، ہر طرح کے آرام کا انتظام کیا۔ مگر اس ہجر کی ماری کے لئے ارام کہاں۔ ہر گھڑی ہر دم نل کو یاد کرتی اور آنسوؤں سے منہ دھوتی۔

دنوں بعد سہدیو بامن کہ راجہ بھیم کی ہدایت پر نل کو ڈھونڈھنے نکلا تھا۔ نگر نگر گھوم کر بستی بستی پھیرا لگا کر واپس آیا، اپنی تلاش کا احوال سنایا۔ کہنے لگا "راجہ رتبرن کی چاکری میں ایک جنے کو دیکھا۔ بس اس پہ مجھے تنک شک ہوا تھا۔"

"اچھا؟" دمینتی نے تڑپ کر پوچھا "کیسا تھا وہ؟ کیا کرتا ہے وہاں؟"

"گھوڑوں کی دویا میں پیرا ہوا ہے۔ رسوئیا بھی نرالا ہے۔ ایسا بھوجن بناتا ہے کہ کتنا ہی کھالو نیت نہیں بھرتی۔ بہت کھانے کے بعد بھی کھانے والا ہونٹ چاٹتا ہے۔"

دمینتی کا ماتھا ٹھنکا "یہ دونوں ہنر تو نل کے ہیں۔ وہ ضرور نل ہوگا۔ برا وقت آ پڑا ہے۔ سو دوسرے راجہ کی چاکری کر کے دن گزارتا ہوگا۔" بس یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ نل کی مصیبتوں کو یاد کر کے رونے لگی۔

"راجکماری، اسے دیکھ کے ماتھا تو میرا بھی ٹھنکا تھا۔ مجھے بھی یہی دھیان آیا تھا کہ

یہ دونوں ہنر تو راجہ نل میں پائے جاتے تھے۔ کہیں یہ اپنا راجہ نل ہی نہ ہو۔"

"پھر؟"

"ساری باتیں راجہ نل کی سی تھیں۔ سارے تیور وہی۔" سہدیو نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "پر وہ اپنا راجہ نل نہیں تھا۔"

"ارے مورکھ جب اس بندے میں ساری نشانیاں نل والی تھیں تو پھر تو نے کیسے جانا کہ وہ نل نہیں ہے۔"

"راجکماری، میں نے کیسے جانا کہ وہ راجہ نل نہیں ہے ایسے کہ اس کی باتیں، اس کے لچھن تو سب راجہ نل والے تھے۔ پر شکل صورت نل والی نہیں تھی۔ کالا بھجنگ، ٹیڑھے ٹیڑھے ہاتھ، پیر، کچھ کبڑا کچھ لنگڑا، ہونٹ لٹکے ہوئے، صورت راکشسوں والی۔ بھلا ایسا منش اپنا راجہ نل ہو سکتا تھا۔"

دمینتی پھریری لیتے لیتے پھر ڈھے گئی۔ دل کے اندر جو امید کی کرن پھوٹی تھی۔ وہ فوراً ہی بجھ گئی۔

"ہے گنی گیانی، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تیرہویں برس کی پرکھشا میں آ کے پانڈوؤں کی کایا ہی بدل گئی ہے۔"

"ہے یدھشٹر تو نے یہ کیسے جانا؟"

"رشی مہاراج، میں نے یہ ایسے جانا کہ سب پانڈو اپنے اپنے بہروپ میں رچے بسے دکھائی پڑتے ہیں۔ نکل سہدیو گوالوں سائیسوں میں رل مل گئے ہیں۔ بھیم رسوئیوں میں ایک رسوئیا۔ ارجن ہیجڑوں کی سنگت میں کتنا مگن دکھائی پڑتا ہے، کیسا ان کی سنگت میں ناچتا گاتا ہے جیسے جنم جنم سے ہیجڑا چلا آ رہا ہو۔ ایک سمے تھے کہ پانڈو راجوں مہاراجوں دیووں سورماؤں کے بیچ الگ پہچانے جاتے تھے۔ اب انہیں کون پہچانتا ہے۔"

"دروپدی تو پہچانتی ہے؟"

http://www.pakurdupoint.com

"ہاں دروپدی پہچانتی ہے۔"

"پانچوں کو؟"

"ہاں پانچوں کو"

"ہے بھارت سنتان کے نرگاؤ"، یہ دس رشی رسان سے بولے "اتم پہچان وہ ہے جو نر ناری کی کرتا ہے اور ناری نر کی کرتی ہے۔ جب تلک ناری اپنے نر کو پہچانتی ہے تب تلک اسے دوسروں کے پہچاننے نہ پہچاننے کی چنتا نہیں کرنی چاہیئے۔ سو تجھے دکھ کیوں ہے اور چنتا کس بات کی ہے۔ تجھ سے زیادہ دکھی نل تھا کہ اسے اس کی ناری بھی پہچان نہیں پائی۔"

یدھشٹر نے اس پہ بہت اچرج کیا "دمینتی نے بھی نل کو نہیں پہچانا؟"

"نہیں۔"

"رشی جی ایسا تو کلجگ میں ہوگا کہ ناری اپنے نر کو اور پتی اپنی پتنی کو نہیں پہچانے گا۔"

"ہے یدھشٹر جو پانڈوؤں اور کوروؤں کے بیچ ہو رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اب کلجگ بھی کونسا دور ہے اور دمینتی کے لئے تو کلجگ اسی گھڑی آگیا تھا جس گھڑی اس کا دھرم پتی سنسان بن میں اسے سوتے ہوئے اکیلا چھوڑ کر گیا اور نل کے لئے کلجگ اس سمے آیا جب دمینتی نے اسے دیکھا اور سندیہہ میں پڑ گئی کہ وہ نل ہے یا نہیں ہے۔"

دمینتی کے اندر جو ایک امید کی کرن پھوٹی تھی وہ بجھ تو گئی تھی مگر پیچھے ایک شک کی لہر چھوڑ گئی۔ کیا پتہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کے لئے بہروپ ہی ایسا بھرا ہو کہ وہ لنگڑا اکبڑا اور مکروہ صورت نظر آئے۔ مگر فوراً ہی اس نے سوچا کہ نل جیسا حسین و جمیل آدمی کیسا ہی بہروپ بھرے اس کی شکل مسخ کیسے ہو سکتی ہے۔ بس کبھی یوں سوچتی کبھی دوں سوچتی۔ خیال کی ایک رو آتی اور اسے بہالے جاتی پھر دوسری بالکل اس کے خلاف رو آتی

اور اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی۔ آخر اس نے طے کیا کہ سہدیو پر اعتبار مت کرو۔ خود اپنی آنکھ سے دیکھ کے فیصلہ کرو۔ مگر اسے دیکھا کیسے جائے۔ بہت سوچنے کے بعد ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ سہدیو بامن کو بلایا اور اسے راز میں لیتے ہوئے کہا کہ بامن جی، تم راجہ رتپرن کے پاس جاؤ۔ میری تعریف کرکے اسے بتاؤ کہ اب دمینتی اپنا سوئمبر پھر سے کر رہی ہے جلدی سے پہنچو اور اسے جیت لو۔

سہدیو نے یہ تجویز سن کر کانوں کو ہاتھ لگائے "راجکماری کیسی پاپ کی بات کرتی ہو۔ تمہارا سوئمبر ہو چکا۔ دھرم پتی موجود ہے۔ آج نہیں تو کل ملے گا۔ بھلا دوسرا سوئمبر کیسے ہو سکتا ہے۔"

"بامن، تم مجھے کیا پاپن جانتے ہو۔ بھلا میں ایسا کام کروں گی۔ یہ تو نل کو بلانے کی ایک چال ہے۔"

"مگر راجکماری۔۔۔۔"

دمینتی نے بات کاٹتے ہوئے کہا "بس اگر مگر مت کرو۔ جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔"

سہدیو نے کہا "اچھا پھر ایسا ہی کروں گا"، اور جھٹ پٹ اجودھیا کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

سہدیو بھاگتا دوڑتا اجودھیا پہنچا۔ راجہ رتپرن سے خلوت میں جاکے ملا۔ دمینتی کے حسن کی تعریف کے پل باندھے۔ سوئمبر کا سندیسہ سنایا، اور ساتھ میں یہ بھی سنایا کہ بس بیچ میں دو دن ہیں۔ راجہ جی پہنچ سکتے ہو تو پہنچ جاؤ۔ دمینتی تمہارے نام کی مالا جپتی ہے تم سوئمبر میں پہنچ گئے تو تمہارے ہی گلے میں مالا ڈالے گی۔"

دمینتی کے حسن کی پہلے ہی چار دانگ میں دھوم تھی۔ سہدیو کے بیان نے اس میں اور رنگ بھر دیا۔ تیر نشانے پر لگا۔ رتپرن تڑپ اٹھا۔ دمینتی کو جیتنے کی آرزو نے بیتاب کر دیا۔ فوراً نل کو طلب کیا کہ "اے باہُک، آج تجھ سے کام آپڑا ہے۔ گھوڑوں کی ودیا

http://www.pakfunplace.com

کو کام میں لا اپنا ہنر دکھا اور منزلِ مقصود پر جلد پہنچا۔"

"اے راجہ، بندہ بسر و چشم خدمت کے لئے حاضر ہے مگر پتہ تو چلے کہ منزل کونسی ہے اور اتنی عجلت کیوں ہے"

"اے باہنگ راجہ بھیم کی پتری ہے دمینتی۔ اس کا سوئمبر ہو رہا ہے بس دو دن بیچ میں ہیں۔"

نل نے یہ سنا اور سناٹے میں آگیا۔ دل ہی دل میں اپنے نصیبوں کو کوسا اور دمینتی کو برا بھلا کہا کہ محبت کا کیسا دم بھرتی تھی اور کتنی جلدی آنکھیں بدل لیں۔ میں ابھی زندہ ہوں اور وہ اپنا سوئمبر رچا رہی ہے۔ مگر پھر اس کا دل نہ مانا کہ دمینتی ایسی بے وفائی کر سکتی ہے۔ سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے میرے یہاں ہونے کا پتہ چل گیا ہے اور وہ سوئمبر کے بہانے مجھے بلانا چاہتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا شک یقین سے بدل گیا۔ فوراً پھریری لی اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اصطبل سے چن کر دو گھوڑے لے۔ انہیں رتھ میں جوت، راجہ کو بٹھا، قمچی لگائی۔ قمچی نے عجب اثر کیا۔ گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

گھوڑے دوڑ کیا رہے تھے۔ ہوا میں بہہ رہے تھے۔ راجہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان میں جھول رہا ہے۔ راجہ آج نل کے ہنر کا قائل ہوا۔ جب ایک ندی کنارے پہنچ کر دم لینے کے لئے رکے تو راجہ نے کہا کہ اے باہنگ، گھوڑوں کی ودیا کچھ مجھے بھی سکھا۔

نل نے کہا کہ "ویسے تو گھوڑوں کی ودیا علم دریاؤ ہے۔ پر جتنا بتا سکتا ہوں بتاتا ہوں"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑوں کی ودیا بکھاننی شروع کی۔ راجہ رتپرن کے دماغ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

پھر نل بولا کہ "گھوڑے جتنی دیر میں دم لیں اتنی دیر میں چوسر کی بازی ہو جائے"۔

راجہ رتپرن کو یہ تجویز پسند آئی۔ بس چوسر شروع ہو گئی۔ راجہ بولا کہ "باہنگ تو اگر گھوڑوں کا ماہر ہے تو میں چوسر میں طاق ہوں۔ تو نے مجھے گھوڑوں کے بھید بتائے۔ اب

تو مجھ سے چوسر کے گر سیکھ سکتا ہے تو سیکھ لے"

راجہ رتپرن نے اسے چوسر کے سارے گر سکھا دیئے اور نل جب چوسر کے سارے گر سیکھ گیا تو کالی راکشس جو اس کے اندر گھسا بیٹھا تھا باہر نکل بھاگا اور اب نل کو لگا کہ جیسے اس کی گئی ہوئی عقل واپس آگئی ہے۔

جب رتھ محل کے قریب پہنچا تو دمینتی رتھ کی آواز سن کر چونکی۔ اسے یاد آیا کہ جب نل رتھ چلاتا تھا تو بالکل اسی طرح اس کے چلنے کا شور ہوتا تھا۔ دل میں کہا کہ ضرور رتھ کو نل چلا رہا ہے۔ لپک کر محل کے دریچہ کے پاس پہنچی۔ جھانک کر دیکھا پہلے رتھ بان پر نظر گئی۔ کالا بھجنگ، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ، چہرہ مسخ۔ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ دل میں کہا کہ نہیں یہ آدمی نل نہیں ہو سکتا۔ فوراً ہی دریچہ بند کر لیا۔ امید کی کرن جو دل میں جگمگائی تھی۔ ایک مرتبہ پھر بجھ گئی۔

نل کی نظریں بھی تو دمینتی کو ٹٹول رہی تھیں۔ اس کی نظریں سیدھی دریچے پر گئیں۔ دیکھا کہ دمینتی نے اسے ایک نظر دیکھا اور منہ پھیر لیا اور دریچہ بند کر لیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

تو کیا میں اتنا بدل گیا ہوں کہ دمینتی بھی مجھے نہیں پہچان پائی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے بدل جانے مسخ ہو جانے کا صدمہ اس کے یہاں پھر سے تازہ ہو گیا۔ کتنے ارمانوں کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا اور کتنی جلدی بس ایک نظر کے ساتھ اس کے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی دمینتی کا اسے دیکھ کے منہ پھیر لینا اور دریچہ بند کر لینا، یہ منظر اس کے تصور میں جم کے رہ گیا تھا۔ اس نے یہ منظر کتنا جھٹلانے کی کوشش کی۔ جتنی کوشش کی اتنی ہی شدت سے وہ منظر تصور میں منڈلایا۔ اس کی نظروں میں اس نے سوچا، کتنی بیگانگی تھی اور کتنی بیزاری سے اس نے منہ پھیر کر دریچہ بند کیا تھا۔ تو میں اتنا مسخ ہو گیا ہوں کہ دمینتی بھی مجھ سے متنفر ہو گئی۔ دمینتی کی بیگانگی اس کے تابوت میں آخری کیل تھی۔ وہ اب تک ایک امید پہ زندہ تھا۔ یہ تو اسے خوب پتہ تھا کہ وہ بدل گیا ہے، نہ صرف بدل گیا ہے بلکہ مسخ ہو گیا ہے، اور یہ کہ اب اسے کوئی

http://www.pakfunplace.com

نہیں پہچان پائے گا۔ مگر دل کے کسی گوشے میں امید کی ایک مدھم سی رمق تھی کہ دمینتی اسے ضرور پہچان لے گی۔ اسی بھروسے پر تو وہ یہاں چلا آیا تھا۔ مگر یہاں آکر امید کی وہ ایک رمق بھی بجھ گئی۔ میرے کھوٹے نصیب، اس نے دل ہی دل میں کہا، کہ دمینتی نے بھی مجھے جاننے اور ماننے سے انکار کر دیا۔ بے شک پوری دنیا مجھے نہ پہچانتی، پر دمینتی پہچان لیتی۔ بس پھر مجھے اعتبار آجاتا کہ میں ہوں۔ اگر تھا بھی تو آج اس بیگانہ نظر کے بعد میں نہیں رہا۔ چونکہ دمینتی کی دانست میں میں نہیں ہوں، اس لئے میں نہیں ہوں یہ سوچتے سوچتے اچانک منہ پھیرنے اور دریچہ بند کرنے کا منظر نئے سرے سے اسے یاد آیا بالکل ایک نئی تفصیل کے ساتھ کہ اس نے اڑتی سی نظر کے ساتھ راجہ رتبرن کو دیکھا تھا اور پہچان لیا تھا تو گویا، اس نے دل میں کہا، دمینتی کی دانست میں راجہ رتبرن تو ہے، میں نہیں ہوں اور کتنی ہی دیر تک یہ خیال اس کے اندر پھانس کی طرح کھٹکتا رہا: راجہ رتبرن ہے، میں نہیں ہوں؟ راجہ رتبرن ہے، میں نہیں ہوں۔

"ہے یدھشٹر" برہ دس رشی نے یدھشٹر کی بات سن کر پھر اپنی بات دہرائی "پھر میں تجھ سے یہی کہوں گا کہ مت جان کہ تو اکیلا دکھی ہے۔ جان اور سمجھ کہ یہ مانو جیون دکھوں کی سمرن ہے جو اس سنسار میں آتا ہے وہ اپنے حصے کے موتی سمرن میں پروتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ جو جتنا جیے گا اتنے موتی پروئے گا۔"

"ہے راج" یدھشٹر نے دکھی دل سے کہا "سمرن اب تو بہت لمبی ہو گئی۔ پانڈوؤں کو آخر کتنے دانے پرونے ہیں اور کیا پہلے سمرن میں دانے کم تھے۔"

برہ دس رشی ہنسے اور بولے "ہے کنتی کے پوت سب دکھی یہی سمجھتے ہیں کہ سب سے زیادہ دکھ انہوں نے جھیلے ہیں اور ہر موتی پرونے والا یہی سوچتا ہے کہ سمرن میں دانے کم تھے۔ سب کے حصے کے موتی اسے پرونے پڑتے ہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔ پر پانڈوؤں کے دکھ جگ سے نرالے ہیں، ایک نرالا دکھ اب جان کو آکے لگا ہے۔"

"وہ کیا دکھ ہے اور کیا اس کا کارن ہے"

راجہ یدھشٹر اس دبدا میں کہ کہیں یا نہ کہیں۔ بہت رک کے بولے "ہے رشی مہاراج، یہ مت پوچھو کہ وہ دکھ کیا ہے۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ اس کا کارن دروپدی ہے"

"دروپدی؟ اس نے کیا کیا۔"

"ابھی کیا تو نہیں ہے۔ کرے گی۔"

"بھولے آدمی، تو نے کیسے جانا کہ کرے گی۔"

"میں نے ہے رشی مہاراج ایسے جانا کہ ابھی تک وہ کیچک سے بدک رہی تھی۔ جب وہ اسے لالسا کی نظروں سے دیکھتا اور اس کی طرف بڑھتا تو کنی کاٹ جاتی یا اسے دھتکار دیتی۔ ایک بار اس دُشٹ نے اس کی کلائی پکڑ لی پر اس نے اسے طمانچہ مارا اور بھاگ کھڑی ہوئی پر کیچک بھی پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی تو ہو گیا۔ سو اب سندر گوڑھوں والی دروپدی ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ آج تو اس نے اس سے رات کو ملنے کا وچن بھی دے دیا ہے" راجہ یدھشٹر نے تھوڑا چپ ہو کر کہا "اب گاؤ دم رانوں والی کو رشتہ دار کے بھی تو کس مرد کے بوتے پر رکے۔ دھننجے ہیجڑا ہو گیا، کام تکتی سے گیا اور مجھے تو دوسرے پانڈوؤں کا حال بھی یہی دکھائی پڑتا ہے۔"

برہ دس رشی سن کے گئے۔ پھر ہنس کے بولے "یدھشٹر، تیرا یہ دکھ نرالا دکھ نہیں ہے۔ راجہ نل نے بھی اپنی جان کو ایسا ہی روگ لگا لیا تھا۔"

"اچھا؟ ..... وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ وہ اس سندیہہ میں پڑ گیا کہ دمینتی نے اس سے آنکھیں پھیر لی ہیں اور راجہ رتبرن کی طرف کھنچ رہی ہے۔"

"مہاراج، وہ نل کا سندیہہ تھا۔ پر میں تو ان اپنے کانوں سنی کہتا ہوں۔ دروپدی نے اس سے آج رات ملنے کو کہا ہے۔"

"دمینتی نے بھی تو راجہ رتبرن کو سویمبر کے لئے بلا بھیجا تھا۔"

http://www.pakfunplace.com

یدھشٹر مہاراج دبدا میں پڑ گئے۔ سوچ کر بولے " اچھا پھر مرگ نینوں والی دروپدی کیا کرے گی۔"

" ہے یدھشٹر پہلے بسن کر دمینتی نے کیا کیا تھا۔"

" کیا کیا تھا؟"

" وہ ہے یدھشٹر یہ تب کی بات ہے جب نل دمینتی کو نرجن بن میں اکیلا چھوڑ کے سٹک گیا تھا۔ دمینتی جب صبح کو جاگی تو دیکھا کہ نل نہیں ہے ادھر دیکھا، اُدھر دیکھا۔ نل کو ڈھونڈتی پھرتی تھی کہ ایک بھوکا اجگر اسے دیکھ کے پھنکارا۔ اسے بس نگلنے کو تھا کہ ایک شکاری وہاں پہ آ نکلا۔ اس نے ایسا تاک کے تیر مارا کہ اجگر تڑپا اور ڈھیر ہو گیا۔ پھر اس شکاری نے دمینتی کو نظر بھر کے دیکھا۔ کیا نار کہ آگ کا شرارہ۔ دھرتی پہ آکاش کا تارہ۔ وہ تو بس ریجھ گیا۔ ترت اسے دبوچ لیا۔ اس نے بہت نا نا کی پر نہ مانا۔ بس ہوتی میں دھاگا پرویا جانے کو تھا کہ اس آبرو والی نے، پوتر ناری نے من ہی من میں پرماتما کو یاد کیا کہ ہے پرماتما میں نے کبھی نل کے سوا کسی مرد کا دھیان کیا ہو تو میں بھسم ہو جاؤں نہیں تو یہ میری آبرو کا بیری بھسم ہو جائے۔ بس آن کی آن میں شکاری نے ہچکی کھائی اور بھسم ہو گیا۔ سانچ کو آنچ کہاں۔ جھوٹا جل بھن گیا۔ دمینتی کی آبرو پہ ذرا جو آنچ آئی ہو۔"

یدھشٹر نے سن کر سوچا۔ پھر کچھ دھیان کر کے پوچھا " پر راجہ رتبرن کی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی کہ اسی کے کارن تو نل کو دمینتی کے بارے میں شنکا ہوئی تھی کہ اس نے اسے جتن کر کے سوئمبر کی آس دلا کے بلوایا تھا۔"

" پھر پتا جی کیا بولے؟" دمینتی نے پوچھا۔

" بولتے کیا۔ سہدیو راجہ رتبرن کی آمد کی تفصیل پیش کر رہا تھا " بس ہمارے مہاراجہ پیچھے میں تھے کہ راجہ جی کیسے اکیلا اکیلا آن براجے۔ پران کی اُدھ بھگت مہاراج نے بہت کی"

" اور راجہ رتبرن نے کچھ کہا۔"

" بس وہ راجہ حیران ہو کے چاروں اور دیکھ رہا تھا۔ یہی دھیان کر کے حیران ہو گا کہ سوئمبر کی کوئی دھوم دھام تو دکھلائی دے نہیں رہی۔ میں گھبرایا کہ راجہ مجھ سے نہ پوچھ بیٹھے۔ بس راجکماری میں تو واں سے چپکے سے سرک آیا۔"

دمینتی بڑبڑائی " میں نے خواہ مخواہ ہی یہ پاکھنڈ کیا۔ بس ایک گمان تھا کہ کیا خبر ہے وہ سائیس کے بھیس میں راجہ نل ہی ہو۔ پر وہ تو کوئی اور ہی نکلا۔"

کیشنی کہ مہمانوں کی خدمت پر مقرر کی گئی تھی اور دمینتی کی منظورِ نظر تھی بیچ میں بول پڑی " پر راجکماری جی ابھی کچھ پتہ تو نہیں ہے کہ یہ آدمی ہے کون۔ اس میں کوئی کوئی بات تو بالکل ہمارے مہاراج نل والی ہے۔"

سہدیو نے فوراً اسے ٹوکا " اری کیشنی کیا اب تو راجکماری جی کو ورغلائے گی۔ میں بھی تو اس کی ایسی ہی کئی باتیں دیکھ کے دھوکا کھا گیا تھا۔ پر میں نے راجکماری جی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس میں مہاراج کی سی کچھ باتیں تو ہیں پر وہ راجہ نل بالکل نہیں ہے اس سمے راجکماری کو میرے کہے کا اعتبار نہیں آیا۔ اب انہوں نے خود دیکھ لیا۔"

" ہاں میں نے دیکھ لیا۔" دمینتی بولی " آدمی کا ہے کو ہے الٹا توا ہے۔ ایسی بھیانک شکل۔ بھلا وہ راجہ نل کیسے ہو سکتا ہے۔"

" بس اس کی بھیانک شکل دیکھ کے ہی تو میں نے جانا کہ یہ راجہ نل نہیں ہو سکتا۔"

سہدیو تو یہ کہہ کے چلا گیا۔ پر کیشنی گھٹنے سے لگی بیٹھی رہی۔ آہستہ سے بولی " پر مجھے شک ہے۔"

" اری تجھے کیا شک ہے۔"

" راجکماری جی، کسی کسی وقت تو باہنگ بالکل کوئی ایسی بات کرتا ہے کہ جیسے مہاراجہ نل ہوں۔"

" کیشنی، تو اس کلموہے کا اب میرے سامنے نام بھی مت لے۔ میں سہدیو کی باتوں

http://www.pakfunplace.com

سے دھوکا کھا گئی تھی۔ اب تو میں نے اسے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے۔" رک کر افسردگی سے بولی۔ "پتہ نہیں، راجہ کہاں نکل گیا اور کس حال میں ہے۔"

کیسنی چپ ہو گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر بولی۔ "میرا تو ایک بات پہ ماتھا ٹھنکا تھا۔"

"کس بات پہ؟" دمینتی یونہی بے دھیانی میں کہہ بیٹھی۔

"اس بات پہ کہ اس نے راجہ رتپرن کے گجرے میں سے گلاب کا ایک چھوٹا سا پھول نکال لیا۔ اسے مسلنے لگا۔ جتنا مسلتا تھا اتنا ہی وہ پھول کھلتا جاتا تھا اور بڑا ہوتا جاتا تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ تو ایسا بڑا پھول بن گیا اور ایسا کھلا ہوا جیسے ابھی ٹہنی سے توڑا گیا تھا۔"

دمینتی نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اری تو مجھے بنا رہی ہے؟"

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"ایسا تو راجہ نل کیا کرتے تھے اور جتنا وہ پھول کو مسلتے تھے اتنا ہی وہ پھولتا تھا اور مہکتا تھا۔"

"یہی تو مجھے دھیان آیا تھا۔"

دمینتی ایک مرتبہ پھر سوچ میں پڑ گئی اور کیسنی نے اپنی مہم جاری رکھی۔ اس کے دماغ میں ایک بات بیٹھ گئی تھی۔ ہر پھر کے وہ اسی بات پہ آ جاتی۔ "راجکماری جی، ایسا ہوا کہ باہنگ کو پیاس لگی۔ پر پیالہ خالی تھا۔ باہنگ نے پیالہ کی اور دیکھا۔ پیالہ پانی سے چھلکنے لگا۔"

دمینتی ایک مرتبہ پھر چونکی۔ "اری یہ بات تو راجہ نل میں تھی کہ خالی پیالہ پہ ایک نظر ڈالی اور وہ پانی سے چھلکنے لگا۔"

"یہی بات تو اس سمے میرے دھیان میں آئی تھی۔"

کیسنی نے ایک بات کہی، پھر دوسری بات، پھر تیسری بات۔ ہر بات ایسی جو راجہ نل سے منسوب چلی آتی تھی۔ دمینتی کا ذہن چکر کھا گیا۔ سوچنے لگی کہ باہنگ میں راجہ نل کی سی خوبیاں کیسے پیدا ہو گئیں۔ وہ شک میں پڑ گئی۔ پھر وہ یہ سوچ کے پریشان ہوئی کہ کیا یہ بڈھا میڑھا

کالا بھجنگ آدمی راجہ نل ہے۔

اور راجہ یدھشٹر نے کیچک کے مارے جانے کی خبر سن کے پہلے تو سکھ کا سانس لیا۔ پھر انہیں چنتا نے آگھیرا۔ انہیں یہ کریدتی تھی کہ اسے مارا کس نے۔ جس ڈھب سے اسے مارا گیا تھا اس سے انہوں نے یہ ٹوہ لی کہ ضرور اسے بھیم نے مارا ہے۔ گھبرائے، دکھی ہوئے کہ بھیم نے یہ کیا کیا۔

اور برہ دس رشی نے انہیں دیکھ کے کہا کہ "ہے راجہ اب تجھے کونسا دکھ ستا رہا ہے؟"

راجہ یدھشٹر نے کہا کہ "ہے رشی مہاراج، بھیم نے کیچک کو ایسا مارا کہ اس کا کچومر ہی نکال دیا۔ میں ڈر رہا ہوں کہ اب کہیں ہم پہچان نہ لیے جائیں۔"

"ہے یدھشٹر کل تک تجھے یہ دکھ کھا رہا تھا کہ پانڈو اب پہچانے نہیں جاتے۔ اب تجھے یہ دکھ ستا رہا ہے کہ پانڈو کہیں پہچانے نہ جائیں۔"

"ہاں رشی مہاراج، بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

تب برہ دس رشی بولے کہ "ہے کنتی کے جنے، ہم سب جیو جنتو دکھ ساگر میں باس کرتے ہیں۔ اکاش اور دھرتی کے بیچ پورب پچھم اتر دکھن دکھ ہی دکھ امنڈا ہوا ہے سو آدمی یوں بھی دکھ میں ہوتا ہے اور ووں بھی دکھ میں ہوتا ہے۔ تیرا حال کچھ نرالا نہیں۔ دمینتی کی بھی یہی دشا ہوتی تھی۔"

"ہے رشی مہاراج، دمینتی کی دشا میری ایسی کس پرکار ہوتی۔"

"راجہ ہوا یوں کہ پہلے دمینتی یہ سوچ کے دکھی ہوئی کہ اس نے اتنا جتن کر کے باہنگ کو بلوایا اس دھیان سے کہ شاید وہ نل ہو، پر وہ نل نہیں نکلا۔ پھر جب اسے شک ہوا کہ شاید باہنگ ہی نل ہے تو پھر وہ یہ دھیان کر کے دکھی ہوئی کہ کیا سچ مچ یہ کالا بھجنگ نل ہے۔"

دمینتی اب آس اور نراش کے بیچ ڈانواڈول تھی۔ باہنگ سے جتنی جتنی نل والی نشانیاں ظاہر ہوتی گئیں اتنا اتنا اس کا شک بڑھتا گیا۔ شک کے ساتھ پریشانی، پریشانی کے ساتھ صدمہ۔ ایک آس اس کے اندر کروٹیں لیتی کہ شاید باہنگ کے بھیس میں راجہ نل ہی ہو۔

http://www.pakfunplace.com

لیکن جب وہ باہنگ کی مسخ صورت کو دھیان میں لاتی تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔ پھر وہ پریشان ہوتی۔ یہ اندیشہ ستانے لگتا کہ کہیں سچ مچ یہ کالا بھتنا ہی راجہ نل نہ ہو اور اس تصور سے اسے کس قدر صدمہ ہوتا۔

دمینتی پہلے تو اسی دبدا میں پڑی رہی۔ بالآخر اس نے جھرجھری لی۔ ایک دم سے اس نے اپنے سارے نیک و بد خیالات کو منسوخ کر دیا۔ دل میں کہا میں یوں ہی پریشان اور مغموم ہو رہی ہوں۔ یہ نل ہے بھی یا کیسنی نے یوں ہی مجھے وہم میں ڈال دیا ہے۔ اچھا میں خود اسے پرکھوں گی۔

سو دمینتی نے کیسنی کے ہاتھ باہنگ کو بلا بھیجا۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس سے جواب سوال کئے۔ ہر پہلو ہر رنگ سے اسے ٹوہا۔

اور راجہ یدھشٹر کے اندر اب پہچانے جانے کا ڈر سما گیا۔ اب انہیں پتہ لگ رہا تھا کہ پہچانے جانے میں کتنی کٹھنائیاں کتنے دکھ ہیں۔ سوچا کہ برہ دس رشی سے پوچھیں کہ اب وہ کیا کہتے ہیں۔ پر برہ دس رشی آج کہیں دکھائی نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس برکش تک گئے جس کی چھاؤں میں وہ براجتے تھے۔ وہاں بھی نہیں ملے۔ راجہ یدھشٹر بہت دکھی ہوئے کہ رشی مہاراج نے کس سمے پہ آ کے سنگت چھوڑی ہے کہ جب پہچانے جانے کی کٹھن گھڑی سر پہ آن کھڑی ہوئی تھی اس کارن کہ ادھر دریودھن کیچک کے مارے جانے کی سن گن سے چوکنا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ پانڈوؤں کا چکر تو نہیں کہ ناری جس پہ کیچک رسیجا تھا دروپدی ہو اور مارنے والا بھیم ہو کہ جس پرکار کیچک مارا گیا ہے اس پرکار تو بھیم ہی آدمی کو مارتا ہے۔ سو دریودھن نے یہ سوچ کے راجہ بیراٹ پہ چڑھائی کر دی کہ پانڈو ہوئے تو لڑنے کے لئے آئیں ہی آئیں اور اس پرکار وہ پہچانے جائیں گے اور اس سمے کہ جب ابھی تیرھواں برس پورا نہیں ہوا ہے وہ پہچانے گئے تو شرط ہار جائیں گے اور پھر انہیں بارہ برس کے بن باس پہ جانا پڑے گا۔ راجہ یدھشٹر دبدا میں پڑ گئے کہ لڑیں یا نہ لڑیں۔ لڑیں گے تو پہچانے جائیں گے۔ نہ لڑے تو راجہ بیراٹ

جس کے وہ چرن میں ہیں ہار جائے گا۔ پر ارجن نے تیرھویں برس کے دنوں گھڑیوں کی گنتی کی اور اب اودی کے سراپ کے دن بھی پورے ہو رہے تھے۔ راجہ کے بیٹے کی کمک پہ چل کھڑا ہوا۔ جب اس سورما کا رتھ رن بھوم میں دوڑا تو دھرتی اور آکاش کا بیچ گڑگڑاہٹ سے بھر گیا۔ اسی پہ بھیم کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ کہیں ارجن کا رتھ تو نہیں۔ بس اسی گھڑی سن سے ایک تیر چلا اور درونا چاریہ نے دریودھن کو چوکس کیا کہ ہے دریودھن سنبھل، دھننجے آ گیا اور دھننجے نے دریودھن کی پوری سینا کو تیروں پہ دھر لیا اور ادھر جب دربار میں راجہ بیراٹ نے جیت کی سوچنا سنی تو بیٹے پوت کی ویرتا کو بہت سراہا۔ پر راجہ یدھشٹر نے یہ کہا کہ مہاراج یہ کاریہ برہنال کا ہے۔ اس پہ راجہ بیراٹ نے جھنجھلا کر کہا کہ تو میرے ویر پتر کی وجے کو ایک ہیجڑے کے حساب میں ڈالتا ہے۔ تاؤ میں آ کر اس نے راجہ یدھشٹر کو تھپڑ مارا۔ تب راجہ یدھشٹر بہت دکھی ہونے پر پھر من میں کہا کہ ہے پانڈو کے بیٹے یہ تیرے ان پہچانے پن کی یاترا میں انتم پرکھشا ہے اور اسی آن راجہ بیراٹ کا بیٹا ارجن کو سنگ لئے دربار میں آن پہنچا اور ترت ہی یدھشٹر کے چرنوں میں گر پڑا کہ راجہ شما کرو کہ ہم نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ راجہ بیراٹ کی یہ دیکھ مت ماری گئی۔ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا کہ اچھا یہ پانڈو ہیں۔

اور نل سوالوں کی اس بوچھار میں متضاد کیفیتوں کے نرغے میں تھا۔ افسوس کہ جو زندگی کی شریک تھی اور دکھ سکھ کی ساتھی تھی وہ بھی پہچاننے سے انکاری ہے۔ نظروں میں کتنی بیگانگی ہے اور رویّے میں کتنی بیزاری ہے۔ پھر دل کو یہ سوچ کر سمجھاتا کہ اچھا ہی ہے۔ نہ پہچانا جاؤں۔ اس مسخ صورت اور بگڑے اعضا کے ساتھ پہچانا جانا کیا بھلا لگتا ہے۔ دمینتی اس حالت میں پہچان کر خوش تو نہیں ہو گی متنفر ہی ہو گی۔ سو اسی میں عافیت ہے کہ دمینتی مجھے نہ پہچان پائے۔ پھر اندیشہ کہ اگر دمینتی نے مجھے پہچان لیا تو؟ سو نہ پہچانے جانے کا غم، پہچانے جانے کا اندیشہ۔ دمینتی کی بیگانگی پر کچھ ملال کچھ غصہ کچھ بیزاری۔ بس اسی عالم میں اس نے سامنے سجے پھولوں میں سے ایک گلاب کا پھول بے دھیانی میں

http://www.pakfunplace.com

اٹھایا اور بالکل بے دھیانی میں مسلنا شروع کر دیا۔ مسلنے کے ساتھ ساتھ پھول کھلنے پھولنے مہکنے لگا۔ دمینتی دفعتاً چونک پڑی۔ کھلتے مہکتے پھولتے پھول کو حیرت سے دیکھا، پھر نل کو غور سے دیکھا۔ اچانک جیسے پہچان لیا ہو دکھ سے چلائی "نل"۔ بس اسی کے ساتھ جیسے کینچلی اتر گئی ہو۔ نل پھر ویسا ہی۔ وہی گوری رنگت، چاند سی صورت۔ وہی وقار وہی زیبائی اور اطمینان کے ایک لمبے سانس کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ وہ ہے۔ خوشی کی ایک گہری لہر اس کے تن میں دوڑتی چلی گئی۔

نل اب واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔ چوسر کی بساط پھر بچھی۔ پھر لشکار اسے بازی لگی۔ ایک بازی، دو بازی اور دسویں بازی پر اس نے اپنا کھویا ہوا سب کچھ جیت لیا۔ ایک دو دس، تیتر کی توڑوں نس، بھتیر کا کھولوں تالا، توگن لے پورے بارہ، بارہ میں لگی رسی، توگن لے پورے اسی، اسی میں لگا جو، توگن لے پورے سو۔

خالی گھر

"آپا رضیہ یہاں پہ میری گیند آئی ہے؟"

"منے، تمہاری گیند نے ہمیں بہت ستایا ہے۔ یہ پڑی ہے، لے جاؤ۔"

رضیہ کے اشارے کی دیر تھی۔ منے تیزی سے گیند کی طرف لپکا۔ اٹھا کر یہ جا وہ جا۔ رضیہ مسالہ اسی طرح پیستی رہی۔ مسالہ پیس کر سل سے سمیٹ کر طشتری میں انڈیلا۔ سل بٹے کو دھو کر اٹھنے لگی تھی کہ گیند پھر ٹپ سے صحن میں آکر گری۔ اب کے رضیہ کو واقعی غصہ آگیا۔ سو جب منے نے ڈرتے ڈرتے دروازے سے جھانک کر پوچھا "آپا رضیہ یاں پہ میری گیند آئی ہے؟" تو وہ بہت برہم ہوئی "کیا گیند گیند لگا رکھی ہے۔ گیند نہ ہوئی بلائے جان ہو گئی۔"

"آپا رضیہ، اب کے لے لینے دو۔ اب نہیں آئے گی۔"

رضیہ ایک دفعہ پھر پسیج گئی مگر اس نے اپنے غصے کے تیور کو برقرار رکھا "لے جا اٹھا کے۔ کان کھول کے سن لے، اب کے آئی تو اسے اٹھا کے چولھے میں جھونک دوں گی۔"

منے نے اس دھمکی پر توجہ دینی بالکل ضروری نہیں سمجھی۔ بس تیزی سے لپک کر گیند اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

رضیہ نے ماچس گھس کر چولہا جلایا، ہنڈیا چڑھائی۔ مسالہ بھون رہی تھی کہ گیند نے پھر صحن میں آکر گدگدایا۔ دنیا کہ سودا خرید کر بازار سے واپس آگیا تھا۔ گیند کی طرف لپکا مگر فوراً ہی اس پر ڈانٹ پڑی "تو کیوں اٹھا رہا ہے۔ چل اپنا کام کر" دنیا کا سارا جوش ایک دم سے ٹھنڈا ہو گیا۔ منے نے ڈرتے ڈرتے دروازے سے جھانکا۔ اس کے کچھ کہنے سے

http://www.pakfunplace.com

پہلے رضیہ برس پڑی "آ تو سہی ادھر۔ میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

منے فوراً غائب ہوگیا۔ رضیہ گیند کو نظر انداز کر کے اپنے کام میں معروف ہوگئی۔ کتنی یکسوئی کے ساتھ اس نے پھر دیگچی میں کف گیر چلانا شروع کیا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

"دیکھ تو سہی دینا، کون ہے دروازے پہ۔"

دینا دوڑ کر دروازے پہ گیا، پھر واپس آیا "آپا جی، ماسٹر صاحب ہیں۔"

رضیہ چولہے سے بادل نخواستہ اٹھ کر دروازے پہ گئی "ماسٹر صاحب۔ آپ کے منے نے ہمیں بہت دق کر رکھا ہے۔"

"بی بی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں"

"اب پرسوں کی بات ہے۔ صبح سے ہمارے گھر میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ دینا باہر کے نل سے ایک بالٹی بھر کے لایا۔ بالٹی ابھی اس نے لا کے رکھی تھی کہ منے کی گیند ٹپ سے آ کے اس میں گری۔ پوری بالٹی پھینکنی پڑی۔"

"اسے۔ سارا پانی پھینکنا پڑا۔"

"ہاں اور کیا"

"میں اس بے ایمان کی ابھی جا کے خبر لیتا ہوں۔ محلہ والوں کو اس نے تنگ کر مارا ہے۔"

"میں پوچھوں ہوں کہ وہ کچھ پڑھتا لکھتا بھی ہے یا ہر وقت گیند ہی کھیلتا رہتا ہے"

"کچھ نہ پوچھو، اس لڑکے نے مجھے بہت پریشان کیا ہے"

"دینا، ارے او دینا"، رضیہ ایک دم سے نرم پڑ گئی "گیند لا کے ماسٹر صاحب کو دے دے۔"

دینا کو یہ بات کچھ نہیں لگی۔ اس نے بے دلی سے گیند اٹھائی اور دروازے پہ جا کر

ماسٹر صاحب کے حوالے کر دی۔ ماسٹر صاحب کی باچھیں کھل گئیں "بی بی، تمہارا بہت شکریہ"

"مگر منے سے کہو کہ گیند ادھر نہ پھینکا کرے"

"اجی میں اس کا یہ کھیل ہی چھڑائے دیتا ہوں۔ بس اطمینان رکھو، اب تمہارے گھر گیند نہیں آئے گی۔"

اور واقعی اس کے بعد رضیہ کے آنگن میں کوئی گیند آ کر نہیں گری۔ کئی دن تک بہت امن رہا۔ مگر ایک دن اچانک ایک گلی صحن میں آ کر گری۔ رضیہ نے حیران ہو کر دیکھا "گلی؟ یہ کس کی گلی ہے۔"

اسی گھڑی منے نے جھجکتے جھجکتے دروازے میں سے گردن نکالی "آپا رضیہ، یاں میری گلی آئی ہے؟"

"اچھا یہ تیری گلی تھی۔ گیند سے خدا خدا کر کے چھٹکارا ملا تو اب گلی شروع ہوگئی۔ ارے میں یہ پوچھوں ہوں کہ تجھے کھیل کود کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔"

منے نے معصومیت سے جواب دیا "نہیں۔"

"تجھے ماسٹر صاحب منع نہیں کرتے؟"

"نہیں"

"ہاں یہی تو ہے۔ ماسٹر صاحب اسے کسی بات سے منع ہی نہیں کرتے۔ جب ہی تو وہ ہوش ہتھا چلا جا رہا ہے۔ ماں زندہ ہوتی تو روک ٹوک کرتی۔"

"آپا جی، اسے گلی مت دو" دینا نے تجویز پیش کی۔

رضیہ نے فوراً ہی اسے ڈانٹ دیا "تو بیچ میں کیوں بول رہا ہے۔" پھر منے سے مخاطب ہوئی "یہ پڑی ہے گلی۔ لے جا۔ اب کے آئی تو اسے چولہے میں جھونک دوں گی۔"

منے نے لپک کر گلی اٹھائی، دینا پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور تیزی سے نکل گیا۔

رضیہ نے گلی کے قصے سے فراغت پا کر کونڈے میں آٹا ڈال کے گوندھنا شروع کیا

http://www.Pakfunplace.com

گر جب گوندھ کر اٹھی تو گلی پھر آکر گری اور اب کے عین کونڈے کے بیچ آکے گری۔ رضیہ کا ایک دم سے پارہ چڑھ گیا۔ سو جب منے نے دروازے میں سے گڑن نکالی اور لجاحت نے گلی مانگی تو اس نے اسے اس بری طرح پھٹکارا کہ اس نے فوراً غائب ہو جانے ہی میں خیریت جانی۔

بس تھوڑی ہی دیر بعد کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ رضیہ نے آٹے کے خراب ہو جانے پر افسوس کرتے کرتے دینا کو دیکھا "ارے دینا، دیکھ کون آیا ہے۔"

دینا لپک جھپک گیا، لپک جھپک آیا "آپا جی، ماسٹر صاحب ہیں۔"

رضیہ کا پارہ ایک دم سے چڑھ گیا۔ اٹھ کر فوراً دروازے پہ گئی۔ دروازے کی اوٹ سے ماسٹر صاحب کو لال پیلی نظروں سے دیکھتے "ماسٹر صاحب، آپ کے منے نے تو مجھے ستا مارا۔"

"بی بی اس نے مجھے بھی ستا مارا ہے۔ مگر اس کا علاج کیا ہے۔"

رضیہ تیزی سے واپس اندر گئی۔ گوندھے آٹے سے بھرا کونڈا دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر لالی اور چوکھٹ پہ رکھ دیا "آپ گلی مانگنے آئے ہیں نا؟ یہ ہے آپ کے منے کی گلی۔"

ماسٹر صاحب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ افسوس بھرے لہجہ میں بولے "یہ تو سارا آٹا خراب ہو گیا۔"

"اجی سستے کا زمانہ تو نہیں ہے اس مہنگائی کے زمانے میں روز اتنا آٹا خراب کرنے کے لئے کہاں سے لاؤں۔"

"ہاں روز تو اتنا آٹا خراب نہیں ہونا چاہیئے۔" چپ ہوئے۔ پھر آہستہ سے بولے "ویسے منے کی گلی ہمیشہ صاف رہتی ہے۔ نالی میں تو وہ اسے کبھی گرنے ہی نہیں دیتا۔"

"مگر" گلی پھر گلی ہے۔ ٹوں لگتا ہے تو اچھی بری جگہ پہ جا کے گرتی ہی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ گلی پھر گلی ہے۔"

"تو میں اب اس آٹے کا کیا کروں۔"

اس سوال پر آکر ماسٹر صاحب بالکل لاجواب ہو گئے۔ سر جھکا لیا۔ کہیں انہیں گھڑکیوں میں منا چپکے سے آکر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا کہ رضیہ کی نظر اس پر نہ پڑے۔ انہوں نے منے کے کان پکڑ کر دروازے کے اندر ڈھکیل دیا "بی بی۔ تمہارا مجرم تمہارے حوالے ہے اسے مارو۔"

منے بالکل مجرم کی طرح رضیہ کے سامنے کھڑا تھا، ڈرا ہوا، سہما ہوا۔ ماسٹر صاحب نے اسے جھڑکا "دیکھ کیا رہا ہے۔ کان پکڑ۔"

منے نے کس عاجزی کے ساتھ اپنے کان پکڑے۔

"توبہ کر۔"

"میری توبہ"

"اب گلی کھیلے گا؟"

"نہیں کھیلوں گا۔"

رضیہ کا چڑھا پارہ فوراً نیچے آگیا۔ آٹے میں سے گلی نکال اس کے حوالے کی "لو اپنی گلی۔ اتنی شرارت اچھی نہیں ہوتی۔ کچھ اپنی مری ماں کا خیال کرو۔ کتنی نیک روح تھی۔ اس سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔"

منے نے اپنی توبہ کو نبھایا۔ رضیہ کے صحن میں اس دن کے بعد سے گلی کبھی آکر نہیں گری۔ مگر پھر یوں ہوا کہ ایک دن چھت پہ پتنگ آکے گری جسے دینا نے فوراً ہی اپنے تصرف میں لے لیا۔ اور جب منے نے آکر اس پر اپنا حق جتایا تو دینا نے اس کا حق تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ویسے صحیح انکار کیا کہ پتنگ بازی کی اخلاقیات گیند بلے اور گلی ڈنڈے کی اخلاقیات سے مختلف ہے۔ پتنگ کٹنے کے بعد اس کی جو اسے لوٹنے میں کامیاب رہا۔ مگر منے پتنگ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ نتیجہ کشتم کشتا دھر پٹخ۔ اور دینا نے آکر رضیہ کو اطلاع دی کہ آپا جی آج میں نے منے کی ٹھکائی کر دی۔" اور ابھی اطلاع اپنی تفصیلات کا تقاضا کر رہی تھی کہ صحن میں ایک روڑا آکے گرا۔

http://www.pakfunplace.com

"اے ہے یہ روڑے کون پھینک رہا ہے۔"

"وہی منے ہوگا۔ جا کے پھر اس کی ٹھکائی کروں۔"

"ارے کمبخت، دیوانہ ہوا ہے۔ چل بیٹھ، اپنا کام کر۔"

دوسرا روڑا۔ تیسرا روڑا۔ اور ایک روڑا سیدھا رضیہ کی کنپٹی پر آ کر لگا کہ عزیب بلبلا گئی۔

دینا باورچی خانے میں جاتے جاتے پلٹا "پکڑ کے لاؤں اسے یہیں پہ لا کے اس کی مرمت کروں گا۔"

"خاک ڈال وہیں کی صورت پہ۔ ہاں ذرا ماسٹر کو بلا کے لا۔ آج میں اس ماسٹر کی ایسی خبر لوں گی کہ یاد کرے گا۔ بہت لحاظ کیا میں نے اس کا۔"

دینا بہت مستعدی سے گیا اور ماسٹر صاحب کو سامنے لے کر آیا۔ آہٹ پا کر رضیہ فوراً دروازے پہ پہنچی۔

"ارے یہ کیا ہوا۔ بی بی تمہاری تو کنپٹی سوجھی ہوئی ہے۔ ہوا کیا؟"

"اپنے بیٹے سے پوچھو۔"

"منے سے؟"

"ہاں منے سے۔ آج اس نے ہمارے گھر میں روڑے پھینکے ہیں۔"

"ماسٹر صاحب جی، منے نے پہلے اک روڑا پھینکا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا اور ایک روڑا اس نے ایسا تاک کے مارا کہ آپا جی کی کنپٹی پہ آ کے لگا۔ آپا جی بلبلا گئیں۔"

ماسٹر صاحب نے خاموشی سے یہ بیان سنا۔ فوراً ہی تیز قدم اٹھاتے واپس ہوئے پھر منے کو گھسیٹتے ہوئے لائے اور رضیہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا "تو نے روڑے مارے تھے؟"

"مارے تھے" منے نے روتے روتے اقبالِ جرم کیا۔

"کیوں مارے تھے؟"

"دینا میری پتنگ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے مانگی تو اس نے مجھے مارا۔"

"تو تو نے اس کے جواب میں اپنی آپا رضیہ کو روڑا مارا۔ بے ایمان" یہ کہتے کہتے ماسٹر صاحب نے منے کے ایک تھپڑ رسید کیا "مرغا بن۔"

منے فوراً ہی مرغا بن گیا

"کان پکڑ اور اپنی آپا رضیہ سے معافی مانگ"

منے نے فوراً اپنے کان پکڑے اور اپنی آپا رضیہ سے روتے ہوئے معافی مانگی۔

"مگر ماسٹر صاحب یہ ایک دن کی بات تھوڑا ہی ہے۔ روز کا قصہ ہے اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ پہلے گھر میں اس کی گیند آئی تھی۔ پھر گلی آنے لگی۔ پھر روڑے آنے لگے۔ اب اس کے بعد اینٹیں آئیں گی۔"

"نہیں بی بی، اینٹیں نہیں آسکتیں۔ جس روز وہ تمہارے گھر اینٹ پھینکے گا میں اس روز اس کا سر پھاڑ دوں گا۔"

"ماسٹر صاحب، صاف بات ہے اپنے بیٹے کا بندوبست کرو۔ ہم میں اب ضبط کی طاقت نہیں رہی۔"

"ٹھیک کہتی ہو" رک کر سوچ کر بولے "اچھا، کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

بندوبست کچھ نہ کچھ ضرور ہوا کہ اس کے بعد نہ گیند نہ گلی نہ پتنگ نہ روڑا۔ رضیہ کو ایک روز ترکاری کاٹتے کاٹتے یونہی خیال آیا "ارے دینا منے کا اب کیا حال ہے۔"

"پتہ نہیں آپا جی"

"منے تو جیسے غائب ہو گیا ہو۔ ماسٹر صاحب نے لگتا ہے کہ اب کے اس پہ واقعی سختی کی ہے۔ چلو اچھا ہے کچھ پڑھے لکھے گا۔ وا ہی تو ا ہی پھرتا تھا سارا محلہ اس سے تنگ تھا۔ اب کیسا امن چین ہے۔"

پہلی دفعہ تو ایک سیدھے سچے اظہارِ اطمینان کے ساتھ منے کا خیال رفع دفع ہو گیا۔

http://www.pakfunplace.com

دوسرے تیسرے دن رضیہ کو ایک دفعہ پھر منے کا خیال آیا۔ "ارے دینا، اس نخت مارے منے کا اب کیا حال ہے۔ کہیں دکھائی دیا۔"

"نہیں آپا جی"

"میں تو جانوں اب ماسٹر صاحب اسے گھر سے قدم ہی نہیں نکالنے دیتے۔ اچھا ہی کرتے ہیں۔ باندھ کے رکھیں گے جب ہی اس لڑکے کی کل سیدھی ہوگی۔ بہت آوارہ ہوگیا تھا۔"

مگر اس مرتبہ اظہارِ اطمینان کے فوراً بعد رضیہ کے یہاں ایک بے اطمینانی شروع ہوگئی۔ کئی مرتبہ مختلف اوقات میں دینا سے منے کا حال معلوم کیا۔ جب وہ کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکا تو اچانک سوال کیا "ارے دینا، کیا کر رہا ہے تو۔"

"برتن مانجھ رہا ہوں جی"

"برتن بعد میں مانجھنا۔ پہلے ذرا ماسٹر صاحب کے پاس جا۔ انہیں بلا کے تو لا۔"

دینا کچھ چکرا کر "بلا کے لاؤں؟"

"ہاں ہاں ذرا بلا کے لا۔ پوچھوں تو سہی کہ منے ہو کیا گیا۔ ڈوبا بالکل ہی غائب ہو گیا۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔"

دینا ماسٹر صاحب کو بلا لایا۔

"بی بی اب کیسے یاد کیا۔" ماسٹر صاحب کے لہجہ میں افسردگی کے ساتھ ایک تلخی بھی تھی۔

"جی میں دینا سے پوچھ رہی تھی کہ ارے تو نے منے کو بھی کہیں دیکھا۔ کتنے دنوں سے اس کی صورت بھی نظر نہیں آئی۔ بولا کہ نہیں۔ اس سے مجھے فکر ہوگئی۔ میں نے کہا کہ جا ذرا ماسٹر صاحب سے پوچھ کے آ۔ وہ آپ کو بلا کے لے آیا۔ منے خیریت سے تو ہے۔"

"ہاں بی بی خیریت سے ہے۔ میں نے روز روز کے قضیوں سے تنگ آکر اسے بھیج دیا۔"

"کہاں بھیج دیا؟"

"اس کی خالہ کے پاس۔"

"خالہ کے پاس۔ اچھا کیوں بھیج دیا۔"

"اب تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ بہت شریر بچہ تھا۔ محلہ بھر کو تنگ کرتا تھا اور تمہیں اس نے کتنا پریشان کر رکھا تھا۔"

"ارے بچے تو پریشان کرتے ہی ہیں اور میں اسے کوئی کم ڈانٹتی تھی۔ انصاف کی کہوں گی، مجھ سے ڈرتا بہت تھا۔ ذرا آنکھ دکھاتی تھی تو سہم جاتا تھا۔ کیوں بھیج دیا اسے۔"

"بس یہی کچھ سوچ کے اسے بھیج دیا۔ اس کی خالہ کو لکھ دیا کہ ذرا اس پہ روک ٹوک رکھو۔"

رضیہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ دل میں ایک خیال کہ میری وجہ سے منے کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اس احساس کے تحت اس نے بار بار دینا کو بھیج کر ماسٹر صاحب سے پوچھوایا کہ منے کی خیریت کا خط آیا یا نہیں اور ماسٹر صاحب رضیہ کی اس دردمندی سے اتنے متاثر ہوئے کہ خیریت کا خط آنے پر خود اطلاع دینے آئے۔ خیریت کی اطلاع پانے پر مست پوچھو کہ رضیہ کتنی خوش ہوئی "ماسٹر صاحب، جب خط لکھو تو میری طرف سے اسے بہت بہت پیار اور دعا لکھنا۔"

"لکھوں گا کہ تمہاری آپا رضیہ تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔"

"اللہ قسم میں تو اسے بہت ہی یاد کرتی ہوں۔ گھر میں اس کی وجہ سے کیسی رونق رہتی تھی۔ کسی نہ کسی بہانے آتا ہی رہتا تھا۔"

"پاس پڑوس والوں کو دق بہت کرتا تھا۔"

"کوئی بھی دق نہیں کرتا تھا اور تھوڑی بہت شرارت تو ہر بچہ ہی کرتا ہے کرنی بھی چاہیئے۔ یہی تو شرارت کرنے کی عمر ہوتی ہے۔"

"میں نے اسے بہت سمجھایا کہ بیٹا گیند بلا ضرور کھیلو مگر ایسے مت کھیلو کہ گیند دوسرے

http://www.pakfunplace.com

کے صحن میں جاکے گرے۔"

"اسے لو۔ یہ خوب کہی۔ گیند تو گیند ہوتی ہے۔ اچھل کے کہیں بھی جاگرے اور جس گھر میں آنگن ہوگا اس گھر میں گیند بھی آکے گرے گی اور گلی بھی آکے گرے گی۔"

ماسٹر صاحب چپ ہوگئے۔ کتنی گیندیں کتنی گلیاں ان کے تصور میں ابھر آئی تھیں۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔"

"اچھا۔" رک کر "میری طرف سے منے کو بہت پیار لکھیے۔"

"ہاں آج ہی خط لکھوں گا اور جب وہاں سے جواب آئے گا تو آکے بتاؤں گا۔"

"ہاں مجھے آکر ضرور بتائیے۔"

ماسٹر صاحب نے اپنے کہے کو نبھایا۔ جب منے کی خالہ کی طرف سے منے کی خیریت کا خط آیا تو وہ سیدھے رضیہ کے دروازے پہ پہنچے۔ خیریت کی خبر سنائی "منے کی خالہ نے لکھا ہے کہ منے وہاں بہت خوش ہے۔"

"اللہ قسم" رضیہ سن کر کتنی خوش ہوئی "ہمیں بھی یاد کرتا ہے۔"

"اس بارے میں تو کچھ لکھا نہیں۔"

"ہائے اللہ" وہاں جاکے ہمیں بالکل بھول گیا۔

"وہاں خالہ کے بچے ساتھ کھیلنے کے لئے مل گئے۔ بس ان کے ساتھ گھل مل گیا۔ بچوں کا تو یہی ہوتا ہے کہ جہاں ساتھ کے بچے ملے۔ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔"

رضیہ افسردہ ہوگئی "ہاں بچوں کو کیا پتہ ہوتا ہے کہ انہیں کون کتنا چاہتا ہے۔ ماسٹر صاحب، آپ کو یقین نہ آئے گا، جب سے منے گیا ہے مجھے تو یہ گھر ہی سونا سونا لگتا ہے اس کے دم سے گھر میں کیسی اہڑ جاہڑ رہتی تھی۔ آنگن میں کبھی گیند گر رہی ہے، کبھی گلی گر رہی ہے۔"

"اور اب اسی سے اندازہ لگا لو کہ میرا کیا حال ہوگا۔"

"ہاں آپ تو باپ ہیں۔ جتنا بھی محسوس کریں کم ہے۔"

"اس کی وجہ سے گھر مجھے بھرا بھرا لگتا تھا۔ اس کی وجہ سے مصروف بھی رہتا تھا۔ اب وہ چلا گیا ہے تو گھر خالی خالی لگتا ہے۔ خالی گھر میں اکیلا بھٹکتا پھرتا ہوں۔"

اس بات کا رضیہ پہ عجب اثر ہوا کہ بولی کچھ نہیں بس ماسٹر صاحب کو دیکھے گی۔ پھر آہستہ سے بولی "آپ نے خواہ مخواہ اسے بھیج دیا۔"

"نہ بھیجتا تو کیا کرتا۔ اصل میں بچے کی دیکھ بھال عورت ہی کر سکتی ہے۔ مرد کے بس کا یہ کام ہے نہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ گھر میں عورت نہ ہو تو نہ گھر درست رہتا ہے نہ بچوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔"

"مت پوچھو کہ گھر کا کیا حال ہے۔ بلکہ اب تو گھر مجھے گھر ہی نہیں لگتا۔"

اسی گھڑی دینا نمودار ہوا "آپا جی، چائے بن گئی ہے۔ پھر ٹھنڈی ہو جاوے گی۔"

رضیہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ دینا سے اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے چائے بنانے کو کہا تھا۔ ادھر ماسٹر صاحب کو خیال آیا کہ انہوں نے خواہ مخواہ رضیہ کو اپنی باتوں میں الجھا رکھا ہے "اچھا میں چلتا ہوں۔"

"نہیں۔ آپ چائے پی کے جائیں گے۔"

اس غیر متوقع پیش کش پر ماسٹر صاحب پس و پیش میں پڑ گئے۔ مگر رضیہ کی پیش کش تھی۔ اسے ٹھکرا بھی نہیں سکتے تھے۔ جب اس نے دوسری بار کہا تھا تو جو تھوڑی ہچر مچر تھی وہ بھی جاتی رہی۔ ماسٹر صاحب نے اس دن پہلی بار اس دہلیز کو پار کیا اور گھر میں قدم رکھا۔

رضیہ چائے میں چینی گھولتے گھولتے دینا سے مخاطب ہوئی "دینا کچھ خبر ہے چینی ختم ہونے لگی ہے۔ اُسے شب برات آرہی ہے۔ کیا ہوگا۔"

"اچھا تمہیں چینی کی ضرورت ہے۔ مجھ سے کہا ہوتا۔ کتنی چاہیئے۔"

http://www.pakfunplace.com

"جتنی بھی مل جائے"

"اچھا دیکھو آج کچھ کرتا ہوں۔"

رضیہ کہنے لگی "بات یہ ہے کہ گھر میں مرد نہ ہو تو بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی چیز کے لئے دوسروں کی محتاجی ہوتی ہے اور آج کل کے زمانے میں؟ آج ہر چیز مشکل سے ملتی ہے۔ عورت ذات کیا کرے۔ مرد کے نہ ہونے سے بڑی مشکل پڑ جاتی ہے۔"

"کوئی ایسی غیریت کی بات نہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو آکر مجھے کہلا دیا کرو۔"

"جس چیز کی بھی ضرورت ہو مجھے اور کونسی مصروفیت ہے اور جب سے منے گیا ہے تو میرے لئے وقت کاٹنا مشکل ہوتا ہے۔"

بس اس کے بعد سے یہی طور ٹھہرا کہ رضیہ کو جس چیز کے حصول میں دقت پیش آتی دینا کے ہاتھ ماسٹر صاحب کو کہلا بھیجتی اور ماسٹر صاحب کسی نہ کسی صورت اس چیز کا بندوبست کرتے اور رضیہ کے گھر پہنچا کر آتے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں رہا کہ دینا کے ہاتھ پیغام پہنچے تب ہی وہ جنس کا بندوبست کریں۔ خود ہی جا کر پوچھ لیتے کہ بازار جا رہا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ وقت فوقت خود اپنی طرف سے بھی تجویز پیش کر دیتے کہ آجکل فلاں چیز مشکل سے مل رہی ہے کہو تو کچھ بندوبست کروں کبھی یوں ہوتا کہ ایک کمیاب جنس کے لئے رضیہ گزارش کرتی اور اس کی فراہمی کرتے کرتے دوسری کمیاب جنس بھی کہیں نہ کہیں سے پیدا کر لیتے اور رضیہ سراپا تشکر بن جاتی۔ جب کھجور مارکہ گھی کے ڈبے بازار سے غائب ہوئے تو رضیہ نے دینا کے ہاتھ ماسٹر صاحب کو پیغام بھجوایا کہ کہیں سے ایک ڈبہ مل جائے تو لا دو۔ ماسٹر صاحب ڈبہ تولے کر آئے ہی، اس کے ساتھ انڈوں سے بھرا لفافہ بھی لائے۔

"یہ کیا ہے" لفافے کو دیکھ کر دینا نے پوچھا۔

"یہ انڈے ہیں۔ انڈے بھی بازار سے غائب ہونے لگے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بالکل

ہی غائب نہ ہو جائیں۔ پھر بہت مشکل پیش آئے گی۔ ایک درجن لے لئے۔" اِدھر اُدھر دیکھا پھر پوچھا "رضیہ نہیں ہیں؟"

"نہیں جی۔ وہ جی پیپل والا جو گھر ہے۔ وہاں آج ختم شریف ہے۔ واں پہ گئی ہیں۔ بس آتی ہوں گی۔"

ماسٹر صاحب نے بیٹھ کر بہت انتظار کیا۔ انتظار ہی انتظار میں پچھلے دن کا جو اخبار وہاں پڑا تھا اسے پورا پڑھ ڈالا۔ آخر اکتا کر لمبی جماہی لی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

رضیہ جب آئی تو گھی کے ڈبے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ لفافہ برابر رکھا دیکھ کر پوچھا "یہ لفافہ کیسا ہے۔"

"یہ انڈے ہیں جی۔"

"انڈے؟"

"ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ انڈے بازار سے غائب ہونے لگے ہیں۔ ایک درجن ہیں۔ بس رکھ لو۔"

"ہائے بچارے ماسٹر صاحب کتنے اچھے ہیں۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ انڈوں کا بھاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ تھوڑے منگا کے رکھ لوں۔ ماسٹر صاحب نے میرے دل کی بات بوجھ لی۔"

"آپا جی، ماسٹر صاحب بہت دیر تک بیٹھے آپ کا انتظار کرتے رہے۔"

"ہائے بچارے ماسٹر صاحب۔ ارے کمبخت آ کے مجھے بتا دیا ہوتا۔"

"میں نے سوچا کہ آپ آتی ہوں گی۔ ماسٹر صاحب بھی یہی سوچ کے بیٹھے رہے۔"

"منے کی کوئی بات کی؟"

"نہیں"

"ضرور منے کا خط آیا ہوگا۔ تبھی اتنی دیر بیٹھے رہے۔ جا ذرا بلا کے تو لا۔"

http://www.pakfunplace.com

ابھی رضیہ یہ کہہ رہی تھی کہ صحن میں گیند آ کے گری۔ رضیہ چونکی "گیند؟ یہ گیند کہاں سے آ گئی۔؟"

دینا نے گیند کا جائزہ لے کر حکم لگایا "یہ تو منے کی گیند ہے۔"

"منے کی گیند؟ ہے تو اسی کی۔ مگر وہ تو یہاں ہے ہی نہیں۔" اور یہ کہتے کہتے بجلی کی طرح ایک خیال ذہن میں دوڑا "ارے کہیں وہ آ تو نہیں گیا۔"

"کیا خبر ہے آپا جی، وہ آ ہی گیا ہو۔"

"جا ذرا دیکھ کے تو آ۔"

اسی آن دروازے پہ دستک ہوئی۔

"ارے دینا دیکھ تو سہی کون ہے۔"

دینا تیزی سے دروازے پہ گیا۔ واپس آ کر بتایا کہ ماسٹر صاحب ہیں۔

"ماسٹر صاحب" رضیہ کتنی خوش ہوئی "ارے انہیں اندر بلا کے لا۔"

ماسٹر صاحب اندر آئے مگر کچھ شرمندہ سے تھے۔ کچھ معذرتی لہجہ میں کسی قدر جھجک کر بولے "رضیہ تمہارے ہاں ہماری گیند آئی ہے۔"

"ہاں ہاں آئی ہے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ منے کی گیند ہے۔ تو کیا منے آ گیا ہے یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

ماسٹر صاحب سٹپٹا سے گئے "نہیں، منے تو نہیں آیا ہے۔"

رضیہ بہت چکرائی "منے نہیں آیا ہے؟ پھر گیند کون کھیل رہا تھا۔ آپ کے گھر میں کون بچہ آ گیا۔"

ماسٹر صاحب نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ آج صبح ہی سے منے مجھے بہت یاد آ رہا تھا۔ کمرے میں اس کا گیند بلا رکھا ہے۔ اسے دیکھ کے مجھے اس کا کھیلنا یاد آ گیا۔ سوچا کہ.... بس کچھ ایسا جی میں آیا کہ وہ نہیں ہے تو میں ہی..... اور تمہارے آنگن

میں بھی تو منے کی گیند بہت دنوں سے نہیں گری تھی۔"

جیسے بھولی بھولی باتیں کرتے ہوئے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بس ویسے ہی رضیہ ماسٹر صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر صاحب ان نظروں کو دیکھ کر ایک دم سے سٹپٹا گئے "اچھا میں چل رہا ہوں۔"

"کیوں منے کی گیند آپ لے کے نہیں جائیں گے؟" رضیہ نے کتنے سکون کتنے انس کے لہجہ میں کہا۔

"ہاں، وہ تو میں بھولا ہی جا رہا تھا" اور ماسٹر صاحب چلتے چلتے ایسے رکے کہ گیند ملے اور فوراً بھاگ کھڑے ہوں۔"

رضیہ نے کتنی محبت کتنی شفقت کے ساتھ کہا "بیٹھ جائیے۔"

اور ماسٹر صاحب ایسے بیٹھ گئے جیسے کوئی بچہ کسی بڑے کا کہنا مانتے ہوئے معصومیت کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔

رضیہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اٹھتے اٹھتے دینا سے کہا "دینا ماسٹر صاحب کے لئے چائے بناؤ۔"

"نہیں رضیہ اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔ چائے میں نہیں پیوں گا۔"

"آپ چائے پئیں گے۔"

ماسٹر صاحب آگے سے کچھ نہ کہہ سکے۔ رضیہ نے صحن میں جا کر گیند اٹھائی۔ لا کر ماسٹر صاحب کے سامنے میز پہ رکھ دی۔

"منے آ جائے۔ پھر آپ کو نئی گیند منگانی پڑے گی اس کے تو گوڈے سے نکل آئے ہیں۔"

"ہاں واقعی، یہ تو بہت پرانی ہو گئی ہے۔ نئی منگانی پڑے گی۔ خیر ابھی تو کونسا آ رہا ہے۔"

رضیہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

دونوں کی نظریں گیند پر تھیں۔ دونوں کو گیند کے واسطے سے اگلے پچھلے واقعات

http://www.pakfunplace.com

یاد آتے چلے گئے دونوں ان واقعات کو یاد کرکے کتنے خوش ہوتے۔ کتنی بار منے کی کسی حرکت کو یاد کرکے ان کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر ایک دم سے اداس ہو گئے اور چپ ہو گئے اتنے میں چائے آ گئی۔ رضیہ نے خاموشی سے چائے بنائی۔ پیالی کو ماسٹر صاحب کے سامنے سرکایا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی "ماسٹر صاحب ایک بات کہوں۔"

ماسٹر صاحب نے رضیہ کو غور سے دیکھا "ہاں کہو۔"

"آپ منے کو بلا لیں۔"

ماسٹر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے "بلا تو لوں مگر رضیہ شاید تم اس بات کو سمجھ نہ سکو۔ گھر میں عورت نہ ہو تو بچے کی مٹی خراب ہی ہوتی ہے۔"

"میں جو ہوں۔"

"تم؟" ماسٹر صاحب نے کچھ حیران ہو کر رضیہ کو دیکھا جیسے بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ رضیہ ان حیران نظروں سے کچھ سٹپٹا سی گئی۔ اپنے لئے چائے بنانے کے بہانے ایک مصروفیت پیدا کر لی۔ پھر ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ مگر ماسٹر صاحب رضیہ کو دیکھتے رہے۔ آج شاید انہوں نے پہلی مرتبہ نظر بھر کر رضیہ کو دیکھا تھا۔ رضیہ ان کی نظروں میں کھبتی چلی گئی۔

"اچھی بات ہے۔" آخر ماسٹر صاحب نے زبان کھولی "ٹھیک ہے...... ہاں ٹھیک ہے۔ بلا لوں گا۔"

خواب میں دھوپ

وہی خواب پھر جاگنے لگا تھا، وہی کھلتا اجلتا منظر، چڑھتا چاند اترتی دھوپ اجلے کی دھوپ میں بکھر بکھر کرتے جوڑے، چاندی بادلا سونا سلما ستارا، سنہری روپہلی گوٹا پٹھک، خوش رنگ خوش وضع بیلیں، بنارسی ساڑھیاں، ریشمیں ململ کے دوپٹے، سرج کی اچکنیں، چکن اور مالینے اور مٹھے اور ودیا ئی کے رنگ رنگ جوڑے کہ صحن میں بچھی ہوئی لمبی چوڑی جاجم پر کہ اوپر اس کے چاندنی بچھی تھی۔ دن بھر بے ترتیب بکھرے پڑے رہتے، دن بھر خالہ جان کی قینچی درمیان ان کے دوڑ چلتی، دن بھر سینے کی مشین کا چاندی سا پہیہ دھوپ میں چمکتا رہتا گھومتا رہتا، رکنے لگتا تو لمبی گوری انگلیاں اس پہ پھسلتی دکھائی دیتیں، پھر سوئی کے پاس پہنچتیں، تاگا پروتیں، پھر دستے پہ آ جاتیں اور پھر چاندی سا پہیہ اس تیزی سے گھومتا کہ شور اس کا میٹھا میٹھا سارے صحن میں بھر جاتا۔ مشین کا میٹھا شور اس کے سامعہ پر پھر چلنے لگا تھا۔ مشن نے اسے ٹھوکا "ہاں تو کیا ہوا پھر؟"

"ہونا کیا تھا،" وہ رکا "بس یار میں بے وقوف ہوں۔"

"وہ تو ہو، تم، مگر پھر؟"

"پھر یہ کہ ...... بھئی ہوا یہ ......" اس کی آواز پھر اکھڑنے لگی، اور اس نے پھر بات بدلی "بات یہ تھی کہ اترے تو ہم خالہ ہی کے گھر تھے پر شادی کا کھڑاگ سارے گھر میں پھیلا تھا، خالہ نے امی سے کہا کہ تم لوگ برابر والے گھر میں چلے جاؤ آرام رہے گا۔ سو ہم برابر والے چھوٹے مکان میں چلے گئے۔ مگر اس مکان میں ہم ٹکتے کب تھے۔ امی تو سارے

http://www.pakfunplace.com

سارے دن خالہ ہی کے پاس بیٹھی رہتیں، شادی کے کام میں ہاتھ بٹاتیں میرے بھی دن میں پھیرے ہوتے ہی رہتے تھے، کبھی کھانے کے لئے جانا کبھی پان کا بہانہ، کبھی جاکر اسی سے پوچھنا کہ آپ نے ہماری وہ کتاب کہاں رکھی، وہ رسالہ کہاں ڈالا۔ مگر اس نے...... مگر بات یہ بھی تو تھی کہ شادی کا گھر تھا۔ مہمان، آنے جانے والے، نائنیں، ڈومنیئیں، پنہاریئیں، کمہارنیں، اس گنوردل میں کیا پتہ چلتا کہ کون آیا ہے اور پھر ہر وقت کام میں مصروف، چک پھیری بنی ہوئی۔ اس ڈھیلے پائنچامے کے تیرتے کنارے اس کی آنکھوں میں سمانے لگے۔ ڈھیلے پائجامے کے یہ اجلے کنارے دنوں اسی طرح ایک شیریں سرسراہٹ کے ساتھ اس کے آس پاس تیرتے رہے تھے۔ شروع شروع میں تو اسے نظر اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اجلے کنارے آس پاس تیرتے رہتے اور نظروں میں سماتے رہتے اور کبھی اتنے پاس آجاتے کہ چاندنی سے پائنچے بلندی تک دکھائی دیتے اور آنکھوں کے سامنے روشنی کا جھرنا گرنے لگتا۔ روشنی کا جھرنا اوجھل ہوتا جاتا، پتلی اجلی دھار بنتا، پھر گم ہو جاتا۔ مگر آنکھوں میں روشنی دیر تک رمی جمی رہتی۔ جانے کتنے بار ٹھمی باندھی کہ نظر بھر کے دیکھے مگر وقت پہ جانے کیا ہو جاتا کہ نظر گھبرا کر بھٹک جاتی۔ کبھی صحن میں قدم رکھتے ہوئے کبھی دالان میں کھڑے ہوتے دور سے اڑتی سی نظر سے دیکھا تھا، پھر بھی وہ صورت ذہن پہ نقش ہوگئی تھی۔ دل میں اتر گئی تھی۔ بظاہر بے خیالی میں اچٹتی نظر ڈالنا اور پھر خود ہی چور بن جانا۔ کسی بہانے جلدی سے اٹھنا اور باہر نکل جانا۔ چاند کی جھلک دیر تک دل و دماغ میں اجالا کئے رکھتی۔ اک منور دھند لکا دماغ پہ منڈلاتا رہتا اور چاندی پہنے پہ چاند سا جو جھلکا ہوا نظروں میں گھومتا رہتا۔ نظر بھر کر دیکھنے کے پھر منصوبے بنتے اور پھر ایک ایک کرکے بچوں کے گھروندوں کی صورت ڈھے جاتے۔ مقام نظر جو متعین نہ تھا۔ نیت باندھی کہ اس وقت مشین چل رہی ہوگی۔ گھر میں داخل یوں ہوں کہ مشین کی سمت نظر ہو۔ داخل ہوتے پہ دیکھا کہ مشین خاموش ہے اور کمرے سے چاندی کے برتنوں کے کھنکنے کی سی آواز آ رہی ہے۔ ارادہ کیا کہ مشین سے اٹھے گی تو دیکھیں

گے۔ مگر وہ مشین پہ ایسا بیٹھتی کہ اٹھنے کا نام نہ لیتی۔ مشین پہ ایسا جم کر بیٹھنا کہ جاجم سے سل گئی ہے۔ اٹھنا تو سارے گھر میں گھومتے پھرنا، آنگن میں، آنگن سے کمروں میں، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، کمرے سے دالان میں، پھر آنگن میں لدپھند کر آنا اور ڈھیر کا ڈھیر ریشمیں کپڑوں کا چاندنی پہ بکھیر دینا۔ اس کی نظروں کے سامنے بہت سے رنگ بکھر گئے۔

"تو کوئی موقعہ نہیں ملا؟" مشن نے سوال کیا۔

"ملا...... آخری دن۔ جیب میں چل رہا تھا۔ عجب اتفاق ہوا۔ میں خالہ کو سلام کرنے گیا۔ خالہ گھر ہی پہ نہیں تھیں۔ شادی کا ہنگامہ تو ختم ہو ہی چکا تھا۔ وہ جاجم اور چاندنی بھی اٹھ گئی تھی۔ آنگن خالی خالی لگ رہا تھا۔ خالہ اور باقی سب سمدھیانے میں گئے ہوئے تھے۔ وہ اکیلی...... اکیلی تھی۔" اس کی آواز پھر اکھڑ گئی۔ اس نے مشن کو دیکھا اور آپ ہی آپ ہنس پڑا۔ بہت ہلکی لالی اس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی۔

"مشن سگرٹ ہے؟"

"نہیں"

"مزہ نہیں آ رہا یار بیٹھنے کا۔ سگرٹ ہونی چاہیئے اچھا میں لاتا ہوں"

"دیکھ بھئی تو بات گول کر رہا ہے۔"

"اللہ قسم نہیں۔ سگرٹ لایا ابھی آیا۔" جلدی سے اٹھا۔ باہر جاتے جاتے پوچھا پان کھائے گا مشن؟"

"کھالوں گا"

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ گلی کے نکڑ پہ دکان تھی۔ سگریٹ سلگائی پان کھایا۔ دل کو کہ ذرا ذرا دھڑکنے لگا تھا، قدرے قرار آیا۔ آیا تھا، وہ فوراً جانے کی نیت سے پر اب سوچ رہا تھا کہ اندر گھٹن ہے، ذرا کھلی ہوا میں سانس لے لوں تو چلوں۔ سگریٹ کے تیز تیز کش لئے۔ پیک تھوکی، پھر دکان میں لگے ہوئے قدِ آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگا۔ اس کا منہ

http://www.pakfunplace.com

رچ گیا تھا، منہ کھولا زبان نکالی، کہ لال بھبھوکا ہو رہی تھی۔ خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی کہ ابھی تو منہ میں پان رکھا تھا اور ابھی سارا منہ رچ گیا۔ یوں ہی خیال سا آیا کہ عجب ہی سی بات ہے کہ پان پہ پان کھایا ہے اور کوئی اثر ہی نہیں جیسے پتے چبائے جا رہے ہیں۔ پر کسی کسی وقت جانے کیا ہو جاتا ہے کہ پان دانتوں میں دبایا — اور منہ میں اُجالا ہو گیا، زبان اور ہونٹ سُرخی سے دمکنے لگے۔ اسے خالہ یاد آ گئیں کہ ہر وقت پان چابتی تھیں۔ پاندان پہ بیٹھی ہیں، خود کھا رہی ہیں دوسروں کو لگا کر دے رہی ہیں اسے پان دیتیں اور ٹکڑا لگاتیں "چندا تمہاری زبان بہت رچتی ہے۔ دلہن بہت چاہے گی۔" وہ جھینپ سا جاتا۔ خالہ اسے دیکھتیں اور کھلکھلا کر ہنس پڑتیں "اے لو شرما گیا، آپا تمہارا لونڈا تو لونڈیوں سے بھی بڑھ کے شرمیلا ہے۔"

"اجی آج کل کی لونڈیئیں کہاں شرماوے ہیں"

"اے ہاں آج کل کون لونڈیا شرماوے ہے اور اجی اس کی شرم بھی چار دن کی ہے۔ دلہن آ جاوے پھر ہم پوچھیں گے کہ لال تم دُلہن کے نام سے لال پڑ جایا کرتے تھے اجی آپا اب تم بیاہ کر ہی دو اس کا۔ ماشے اللہ جوان ہو گیا ہے۔" اور پھر ایک لال رمق اس کے گالوں میں، کانوں کی گوری لووں میں تیر گئی۔ آئینے میں چہرہ دیکھا منہ اندر باہر سے لال ہو رہا تھا۔ اسے بے کلی سی ہونے لگی کہ اس کا منہ اتنا کیوں رچ گیا ہے۔ ہونٹوں سے رستی ہوئی لالی کو رومال سے صاف کیا۔ ہونٹ پھر بھی لال لال تھے۔ رومال اس نے جیب میں رکھ لیا اور آئینے سے پرلی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سامعہ پہ یورش جاری تھی۔ فضا میں کھوئی ہوئی آوازیں پھر کانوں میں آ رہی تھیں۔

"اجی آپا آپ نے اس کی مونچھوں کا کونڈا نہیں کیا؟"

"نا بی میں ایسے چونچلے نہیں کرتی ہوں۔ بڑا لی اسی کی مونچھیں نکلی ہیں کیا۔ جو جوان ہو گا۔ اس کی مسیں بھی بھیگیں گی۔"

"اجی خیر مسیں تو دُنیا کے لونڈوں کی بھیگے ہیں۔ پر اللہ نظر بد سے بچاوے ہمارا لونڈا چاند کا ٹکڑا ہے اور ابھی ایک بیٹا ہے اللہ اسے جیتا رکھے۔ نذر نیاز تو کرنی ہی چاہیئے۔ آپا اب اس کا بیاہ کر دو۔"

"اے یہ تو نے اچھی بات کہی، بچارے میں سے نکلا نہیں ہے، بیاہ کر دو۔"

"نا اللہ قسم سچ کہہ رہی ہوں۔ اللہ رکھو ایک بیٹا ہے اس کا تو نہیں جلدی بیاہ کرنا چاہیئے۔ چاند سے بیٹے کی چاندنی سی دلہن لاؤ، گھر میں اُجالا ہو جاوے گا۔"

"اے ابھی پڑھ لکھ تو جاویں، نوکری کریں شادی بھی ہو جاوے گی۔ ابھی کس منہ سے پیغام ڈالوں۔ بیٹی والی یہ نہ پوچھے گی کہ بی بی تمہارا بیٹا کیا کرتا ہے۔"

"یہ کیا بات کہی تم نے۔ اللہ کا دیا اس کے باپ کے گھر سب کچھ ہے۔ دلہن پھولوں میں تلے گی۔ جب اس کی نوکری کا وقت آوے گا تو وہ نوکری بھی کرے گا۔ اس کے لئے کیا نوکریوں کی کمی ہے۔ ٹھوکروں سے لگی پڑی ہیں۔ اجی ہمارا لونڈا کسی بات میں ہیٹا نہیں ہے۔ صورت شکل میں بھی ماشے اللہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ جس ڈیوڑھی پہ قدم رکھے گا اسے چاند لگ جاویں گے" — وہ پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں اس کے گالوں میں اجالا ہو رہا تھا کہ جانو چاند اندر اُترے ہوئے ہیں۔ وہ جھینپ سا گیا۔ گالوں اور لووں کی لالی تیز ہو گئی۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

اس نے تیز تیز چلنا شروع کیا تھا، مگر چند قدم چلنے کے بعد اسے خیال ہوا کہ وہ تو بہت جلدی گھر پہنچ جائے گا۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو وہ آیا ہی ہے۔ رفتار کو روکا اور ہولے ہولے چلنے لگا۔ دل کے قریب ایک برات اُتری تھی اور بدن کے شہر میں دیوالی ہو رہی تھی۔ بدن کا شہر جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور خواب منور ہو گیا تھا۔ جھلابور جوڑے، چکاچوند کرتا چاندی پہیہ، ننھے منھے ہلکے کل پرزوں کا شور بیٹھا میٹھا کہ آن کی آن میں تیز ہوتا سارے آنگن میں کانوں کے پردوں میں دل کے صحن میں بھر جاتا اور آن کی آن میں دھیما پڑتا ڈوبتا چلا جاتا، گوری لمبی ہلال ایسی انگلیاں کہ دستے سے چاندی پہیئے پر چاندی پہیئے سے سفید

http://www.pakfunplace.com

چمکتی سوئی کے قریب آتیں، بلبی لیٹیں، مشین پر جھکی ہوئی گوری چاند ایسی صورت۔ رنگوں، روشنیوں آوازوں کا ایک سیلاب صحن میں اُمنڈتا رہتا۔ ہر رنگ، روشنی اور آواز کا یہ ننھا بھنور اس کے دھیان کی رَو کو اپنے چکر میں اُلجھائے رکھتا۔ شادی بیاہ کے ہنگاموں سے بے خبر اسی ایک کیفیت میں گم، کبھی نظر کے ذریعہ کبھی دھیان کی معرفت، بار بار دیکھنا، پھر سوچنا سوچتے رہنا اور امنگوں کی برات چڑھانا، اس تمنا سے دیکھنا کہ سارے بدن کا جی آنکھوں میں کھنچ آتا اور پھر وہی پیاس وہی بیکلی، نظر کی جھجک جاتی رہی تھی۔ لیکن جھجک کے اور ان گنت پردے کیسے حائل ہوئے تھے۔ وہی ایک گھر تھا ایک آنگن کہ بیاہ کے ہنگامے میں بہتے ہوئے کبھی پاس آجاتے کبھی ذرا دُور ہو جاتے مگر سات سمندروں کا فاصلہ ہر صورت قائم رہا۔ لگتا کہ ایک بول ان سات سمندروں کے فاصلے کو یوں طے کرلے گا مگر یہ ایک بول زبان پہ کبھی نہ آیا۔ بات کرنے کے ان گنت منصوبے باندھے۔ ہر منصوبہ امنگوں کی برات بنا۔ ہر برات دھوم سے چڑھی مگر دلہن کی ڈیوڑھی پہ قدم رکھنے سے پہلے بکھر گئی اور وہ آنگن کہ رات دن رنگوں روشنیوں آوازوں کا ایک سیلاب وہاں اُمنڈتا رہتا تھا، دیکھتے دیکھتے کیسا خالی ہوا کہ نہ زرق برق کپڑوں کی بے ترتیب ڈھیریاں، نہ مشین کا شور، نہ جاجم چاندنی نہ شامیانہ، نہ تانیں، سہانے گیت، ڈومنیں، جیسے آئی برات رخصت ہو گئی ہو اور آنگن میں جھاڑو دل گئی ہو۔ بس بیچ آنگن میں ایک دیولا جل رہا تھا کہ اب اس کے دل کے قریب ٹمٹماتا تھا اور بدن کے شہر میں دیوالی ہو رہی تھی۔ بدن کے شہر میں دیوالی ہو رہی تھی کہ روشنی کی ایک بوند دل میں ہنگامہ آرا تھی۔ خالی اکیلا آنگن، چارپائی پہ بیٹھی ہوئی، ہاتھ میں لمبی لمبی دھوپ سی سلائیاں کہ اون سے اُلجھ رہی تھیں۔ پھندے ڈال رہی تھیں۔

"حد کر دی سگریٹ لینے گیا تھا کہ سونے گیا تھا۔" مشن کی آواز سے وہ ہڑبڑا اٹھا۔ خیالوں کی برات کے ساتھ وہ کمرے میں آگیا تھا، اس نے پھریری لی، خواب سے جاگا، بولا "یارو سگریٹوں کو کیا ہو گیا ہے۔ پھر عنقا ہو رہی ہیں" پھر جیب سے

سگریٹ کا پیکٹ نکالا، مشن کو پیش کیا، دیا سلائی سے سلگایا، پھر پان پیش کیا۔

مشن نے پان لیتے لیتے اسے دیکھا، ٹھٹکا، بولا "خوب۔ بڑے زور کا بیڑا کھایا ہے۔"

جھینپتے ہوئے بولا "یار یہ ہمارا پنواڑی پان اچھے لگاتا ہے۔"

"ویسے تم بھی آج اچھے لگ رہے ہو۔"

اس کے گورے لو دیتے گالوں پہ لالی کی اک لہر دوڑ گئی۔ پھر کہنے لگا "یار ان سگریٹوں نے بڑا تنگ کیا ہے۔ ان کا کچھ بندوبست ہونا چاہیے۔"

"ہاں یار یہ عجب مصیبت ہے۔" مشن بولا اور پھر جلدی سے موضوع بدلا "ہاں تو وہ قصہ کیا تھا، بیچ ہی میں رہ گیا۔"

"ہاں وہ قصہ" وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر گیا، پیک تھوکی، چھنتی ہوئی برات پھر جگمگاٹا کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس برات میں گھل مل جائے اور مشن کی پہنچ سے دُور نکل جائے، چھپ جائے۔

"ہاں" واپس آیا تو مشن نے پھر ٹوکا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا" پھر اس کا دل دھیرے دھیرے دھڑکنے لگا تھا۔ رکا، کھنکارا، پھر بولا "ہاں...... وہ اکیلی بیٹھی تھی...... سب گئے ہوئے تھے۔ خالہ اور باقی سب سمدھیانے گئے ہوئے تھے۔ جاجم اور چاندنی اُٹھ گئی تھی۔ آنگن خالی خالی لگ رہا تھا... بس وہ بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا خالہ کہاں ہیں، بولی باجی کی سسرال گئی ہیں، اسی طرح سلائیاں چلاتی رہی نظر بھی تو اوپر نہیں اٹھائی۔ میں چلنے لگا۔ چلتے چلتے میں رکا، بولا اچھا تو میں اس گاڑی سے جا رہا ہوں، خالہ کو سلام...... جاتے ہیں آپ —— اس کے ہاتھوں میں گردش کرتی ہوئی سلائیاں ایک ساتھ رک گئیں اور نظریں مجھ پہ اُٹھ گئیں ہاں —— میری آواز گلے میں رُکنے لگی...... اس نے پھر سویٹر پہ نظریں جما لیں اور پھر وہ لمبی دھوپ سی سلائیاں پہلے ہولے ہولے پھر تیزی سے گردش کرنے لگیں۔"

http://www.pakfunplace.com

وہ چُپ ہوگیا۔

مشن پہلے تو چپ بیٹھا رہا، پھر اسے بے قراری ہوئی، بولا "پھر؟"

"پھر؟" وہ چونک سا پڑا "پھر میں کھڑا رہا..... پھر میں..... پھر میں چلا آیا..."

مشن اسے تکنے لگا "بس؟"

"بس" وہ بے کلی وہ گرمی اس کی آواز سے رخصت ہوگئی تھی۔ وہ چُپ پان کی سُرخی کی شادابی ہلکی ہو چلی تھی اور گالوں میں اُترے ہوئے چاندمندے تھے۔ بیٹھے بیٹھے اس نے جھرجھری لی، مشن کو دیکھا اور کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا۔ "یار میں بہت بیوقوف ہوں"

اور یہ کہتے کہتے وہ کتنا افسردہ ہوگیا۔

---

http://www.pakfunplace.com